معارف

جون ۲۰۲۱ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپئے

دیگرممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپئے۔ دیگرممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضروردیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

☏ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۷ ماہ شوال المکرم ۱۴۴۲ھ مطابق ماہ جون ۲۰۲۱ء عدد ۶

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

گذشتہ ایک سال سے ذاتی، قومی، ملی اور عالمی مسائل و مصائب کا شور ماتم کم ہوا نہ نوحہ کی لے ٹوٹی، مصیبتوں اور مشکلوں اور زندگی کے نام پر مرمر کے جیے جانے کا شکوہ تو اس دنیا میں انسانی وجود کے روز اول سے ہے اور مسلسل ہے، حد یہ ہے کہ صبر ایوبؑ بھی مَسَّنِيَ الضُّرُّ کی فریاد سے شکوہ کناں سمجھا گیا:

آپ نے مسنی الضر، کہا ہے تو سہی یہ بھی یا حضرت ایوبؑ! گلا ہے تو سہی

پھر ہماری کیا بساط کہ اپنی دنیا کے انسانوں کو دیدۂ خوں بار میں بدلتا دیکھیں اور پھر بھی ستم گاریوں کا رونا ہم سے سرزد نہ ہو، زندگی کی ویرانی کے لیے کورونا کی وبا یا بلا کی دوسری لہر نے جو قیامت بپا کی، خصوصاً اپنے ملک میں جس طرح حیات تہ بہ خاک ہوئی اور سانسوں کی آمد و رفت شعلوں کی لپٹ میں بدلی، خدا جانے قیامت سے پہلے انسانی زندگی کی روداد تیار کرنے والوں کو اس کی تفصیل میں جانے کی ہمت کیسے ہوگی، گذشتہ مہینہ قبرستانوں، شمشان گھاٹوں اور دریاؤں اور ندیوں کے ساحلوں نے انسانوں کی بے کسی، بے بسی اور دوسری طرف بے حسی اور بے دلی کا جو تماشا دیکھا اس کے لیے شاید المیہ خداوندی کے عنوان سے ہزاروں الفاظ و تعبیرات کے شاعرانہ تاثرات بھی کم ہوں، خاک و خون کی اس گہری دھند میں شکر ہے کہ وہ چمک اور رمق بھی ملتی رہی جس سے انسان حقیقی کا چہرہ پہچانا جاتا ہے، یہ مقام شکر ہے کہ ان چہروں میں بڑی تعداد ان کی تھی جن کے دم سے کبھی شبستان وجود روشن رہتے تھے اور جو بے شبہ ان کی یادگار ہیں جنہوں نے ثابت کیا تھا کہ آگ بھی انداز گلستاں پیدا کر سکتی ہے، ان بچوں اور جوانوں کے لیے دعائیں دل سے نکلتی ہیں جو انسانی خدمت کی علامت بن گئے، یہ صرف آکسیجن اور دواؤں اور غذاؤں کو تقسیم ہی نہیں کر رہے تھے، بندوں کی مدد میں خود اپنے خدا کی مدد پانے کی سند بھی حاصل کر رہے تھے۔

ایک طرف یہ پراسرار بندے، فضاؤں میں گم ہوتی سانسوں کو زندگی کے کاروبار کے لیے واپس لانے میں مشغول تھے تو دوسری طرف فلسطین کے ناسور کو ناقابل علاج بنانے والے انسان نما حیوان بلکہ حیوانوں سے بھی پست تر اسرائیلی مسجد اقصیٰ، بیت المقدس اور غزہ میں بے گناہوں اور معصوموں کے ساتھ قوت و اقتدار کی خونی نمائش میں مشغول تھے، غزہ کی عالیشان عمارتوں کو کھنڈروں میں، معصوم اور پھول سے بچوں کو خونی شعلوں کی شکل میں دیکھ کر ایک دنیا مجسم درد الم بن گئی لیکن

انسانیت کے دشمنوں کو ہمیشہ کی طرح ایسے قابل نفریں جرم کے ارتکاب پر بھی کوئی شرم نہیں، وہ جن کے وجود اور مقدر پر ذلت و مسکنت کی ابدی لعنت مسلط کر دی گئی، ان کو شرم آتی بھی تو کیسے؟ ناجائز وجود کی فطرت میں بے حیائی اور ڈھیٹ پن کے سوا اور ہوتا بھی کیا؟ لیکن اصل سوال تو اس سرزمین عرب سے ہے جس کے لیے پرسوز چشم ولب کہتے رہے کہ: ع محمد عربیؐ سے ہے عالم عربی۔ معارف نے اپنی زندگی میں اسرائیل کے وجود میں آنے سے پہلے اور پھر اسلام و یہودیت کے اس مسلسل تنازعہ میں ہمیشہ بنیادی وجہوں کی جانب اشارہ کیا، اشارہ کیا بلکہ صراحت کی، ۴۵ء میں جب اسرائیل نامی خنجر فلسطین کی گردن میں ابھی پیوست نہیں ہوا تھا، معارف نے کہا تھا کہ اس وقت دنیا میں یہود سب سے بڑی مالی طاقت کے مالک ہیں، امریکہ کے سونے کے خزانوں میں ان کا بڑا حصہ ہے، برطانیہ کو بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے اور یہ صرف امریکی یہودی سرمایہ داروں سے حاصل ہوسکتا ہے، اس لیے سرزمین فلسطین پر بالفور سے ٹرومین تک جو ہو رہا ہے یا ہوگا وہ یہودیوں کی سامری طاقت کا کرشمہ ہے، انہوں نے مصر سے نکل کر حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جس سونے کے بچھڑے کی پوجا کی تھی وہ آج تک اسی پوجا میں مصروف ہیں، ان کے متعلق قرآن پاک کا بیان ''وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ'' آج بھی (۴۵ء) حرف بحرف صادق ہے، آج ۲۰۲۱ء میں جو کچھ اس خطہ میں ہو رہا ہے وہ اسی پچھتر سال قبل پہلے کے معارف کی دوربینی کی تصدیق ہے، حالات میں تغیر نہیں تو وجہ بھی ہے کہ انسانوں کے اخلاقی معائب بھی وہی ہیں اور طبائع کے رذائل بھی وہی۔

اخلاقی عیوب اور طبیعتوں کے رذائل کے مستقل ہونے کی ایک شکل، ہمارے ہاں کے ایک مخصوص نقطۂ نظر اور طرز فکر کی حامل ایک جماعت کی بھی ہے جس کو دعوی تو ثقافتی اور تہذیبی اصلاح کا ہے لیکن جس کو خدا کے گھروں کو مسمار کرنے میں ذرا بھی عار نہیں، ابھی رام سنہی گھاٹ بارہ بنکی میں ایک قدیم مسجد کو جس طرح غیر قانونی اور غیر اخلاقی اور ڈھٹائی اور دیدہ دلیری سے ڈھا کر اس کو بے نام و نشاں کر دیا گیا وہ محض ایک مسجد کی شکستگی اور انہدام کی قابل نفریں حرکت ہی نہیں، اس ملک کو صہیونیت کی اس آگ میں جھونکنے کی تیاری ہے جس سے سارا عالم بے زار ہے، جنہوں نے ہنود و یہود کی ایک ہی اصل سے ہونے کی بات کہی، اب تصدیق اسی کی ہو رہی ہے، یروشلم میں اقتدار کی چاہت ہیکل سلیمان کے درپے ہے تو یہاں یہی لالچ بارہ بنکی اور کھتولی کے کھنڈروں کی زبانی آشکار ہے لیکن یہ دراصل ان

کے لیے چشم کشا ہے جو کسی نہ کسی درجہ قرآن وصاحب قرآن اور حامل قرآن پر ایمان کی دولت رکھتے ہیں کہ جہاں قرآن مجید نے عبادت گاہوں اور مسجدوں کے انہدام کرنے والوں سے آگاہ کیا ہے وہیں ایک وعدۂ خداوندی کا اعادہ بھی کر دیا ہے کہ ''وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ'' جو خدا کے گھروں کو برباد کرنے والوں کے مدمقابل ہوتے ہیں اللہ ان کی مدد کرکے رہتا ہے، اس لیے کہ اصل طاقت اور اصل غلبہ صرف اسی کو زیبا ہے، یہ اور بات ہے کہ شیطانی اور طاغوتی گروہ ہر دور میں فرعون وہامان اور سامری وقارون اور نمرود وبوجہل کی شکل میں آتے رہتے ہیں اور بھٹکتے اور بہکاتے رہتے ہیں، ہندوستان کے ایک خاموش، پرسکون جزیرہ لکش دیپ کے سمندروں میں کچھ ایسی موجوں سے آشنا کرایا جارہا ہے جو موجۂ خوں بن کر ایک خاموش، مثالی اور پرسکون جگہ کی خوشیوں کو بہا لے جائے، شیطانی حرکتوں پر لعنت ملامت کرنے سے پہلے اس حقیقت کو کاش ہماری قوم کا سیاسی شعور بھانپ لیتا کہ جذباتی فیصلوں پر آمادہ کرنے والے ''فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' کہہ کر کیسے اپنا دامن جھاڑ لیتے ہیں۔

ادھر مصائب کی یلغار میں سب سے بڑھ کر امت کے ان افراد کا آنکھیں موند لینا ہے جن سے امت کی عزت بھی تھی اور زینت بھی، کیسے کیسے فخر روزگار چند ہفتوں میں الفراق کہہ گئے، اب تو ناموں کے شمار کی بھی ہمت نہیں، مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری، مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی، مولانا سید محمد حمزہ حسنی، ڈاکٹر عبید اللہ فراہی، مولانا اسیر ادروی، مولانا محفوظ الرحمٰن عثمانی، پروفیسر شمیم حنفی، رئیس الشاکری ندوی وغیرہ، ان میں سے ہر ایک کی زندگی قابل رشک اور دوسروں کے لیے لائق تقلید، مدتوں یہ ہستیاں یاد کی جائیں گی، اسی طرح مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے لائق ترین اساتذہ، اب چراغِ رخِ زیبا لے کر ڈھونڈنے سے بھی یہ نہیں ملنے والے، اعظم گڑھ میں بھی ایسوں کی ایک صف اٹھ گئی اور خدا جانے ماتم کی کتنی صفیں بچھا گئی، ڈاکٹر خورشید جن کا لقب اگر فرشتہ صفت یا مسیحا نفس ہوتا تو کوئی اسے مبالغہ نہیں سمجھتا، وہ اور ڈاکٹر حکیم الدین، ڈاکٹر عالمگیر، ڈاکٹر خالد حسن نیازی، ڈاکٹر فرید، مرزا اطہر معین بیگ یہ سب رخصت ہوئے اور ابھی ابھی معلوم ہوا کہ مفتی عبدالرزاق بھوپالی اور مولانا نذر الحفیظ ندوی بھی راہی ملک عدم ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، رہے نام اللہ کا۔

مقالات

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

کی تفسیری، حدیثی اور دیگر خدماتِ علمی پر ایک نظر

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی ☆

حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے (درمیانی تینوں صاحبزادگان) حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر (۱) رحمہم اللہ تعالیٰ کا زندگی بھر کے علم و مطالعہ اور خدمت و تبلیغ کا محور، قرآن کریم کے مطالب و تعلیمات کو عام فرمانا، اس کا مفہوم، ترجمہ اور پیام تمام مسلمانوں تک پہنچانا اور اس پر عمل کی کوشش کرانا تھا، اس میں ان حضرات کی علمی، تصنیفی خدمات اور وہ نادر زمانہ، گراں مایہ علمی آثار و نقوش بھی ہیں، جو پوری امت کو فہمِ قرآن، بصیرتِ قرآن، عملِ قرآن اور قرآن کریم سے محبت و تعلق بخش رہے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی خدمات قرآن اور تصانیف، ترجمۂ قرآن کریم، فتح الرحمٰن اور الفوز الکبیر کسی تعارف کی محتاج نہیں، اسی طرح شاہ عبدالعزیز کی خدمات قرآن بھی اسلامی، علمی تاریخ کا روشن باب ہیں، شاہ صاحب کی ان خدمات میں اگرچہ عموماً صرف تفسیر فتح العزیز کا نام متعارف ہے لیکن ان کے اور بھی قرآنی آثار ہیں۔

تفسیر میں تحریری خدمات: حضرت شاہ صاحب اپنے والد گرامی کا مثنی، درس تفسیر اور فہم مقاصد و مطالب قرآن کریم میں بے نظیر و بے عدیل تھے۔ ان کی قرآنی خدمات اگرچہ وسیع و کثیر نہیں ہیں، لیکن ان کی جامعیت و معنویت، ان کی بے پناہ افادیت، تاثیر اور برصغیر میں قرآن کریم کی گرہ کشا اور ایک بڑی کلید ہونے میں کسی کو بھی شک و شبہ نہیں ہے۔

درس قرآن مجید، تفاسیر قرآن مجید، افادات قرآن مجید، ہر ایک، اک گراں بہا سرمایہ اور ہندی ملت اسلامیہ کی، دینی علمی خدمات اور تفاسیر قرآن مجید کی لمبی فہرست میں، صف اول کی یادگار و

☆ E-mail: nhrashidkaandhalavi@yahoo.com

رہنما ہے۔سب سے پہلے شاہ صاحب کی ایک گمنام مگر مکمل تفسیر قرآن مجید کا تذکرہ جو مفقود ہے۔

شاہ صاحب کی تفسیری خدمات میں عموماً صرف تفسیر فتح العزیز کا تذکرہ کیا جاتا ہے، فتح العزیز بھی اگرچہ بہت اعلیٰ درجہ کی تفسیر ہے مگر وہ اس موضوع پر ان کا پہلا کام یا کارنامہ نہیں ہے، شاہ صاحب نے اس کی تالیف سے غالباً برسوں پہلے ایک اور مفصل تفسیر لکھی تھی، شاہ صاحب کے ایک خادم اور شاگرد حاجی حسین سہارنپوری سے روایت ہے کہ شاہ صاحب کی قرآن مجید پر ایک اور مستقل تصنیف تھی اور یہ مکمل تفسیر تھی جو تمام قرآن مجید کا احاطہ کرتی تھی۔عبدالرحیم ضیا کی اطلاع ہے:

"کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک تفسیر فارسی، تمام قرآن مجید کی، اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے، مگر وہ چھپی نہیں۔" (۲)

افسوس کہ اب تک اس نادر تفسیر کے کسی اور نسخہ کا سراغ نہیں ملا، اللہ کرے کہیں محفوظ ہو اور ضائع نہ ہوئی ہو۔

شاہ صاحب نے اپنے فتاویٰ اور بعض رسائل میں، اس تفسیر کے بعض اقتباسات نقل کیے ہیں اور آخر میں یہ صراحت فرمائی ہے کہ وہ اس کو اپنی تفسیر (فتح العزیز) سے نقل کررہے ہیں، مثلاً:

(الف) سورۂ نساء کی آیت: ۵۶ کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"من تفسیر فتح العزیز فی سورۃ النساء، تحت قولہ تعالیٰ: كُلَّمَا نضجت جلودھم بَدَّلنَاھُم جلوداً" (۳)

(ب) سورۂ ہود کی آیت: ۷ کے تحت کلام کرتے ہوئے، سورۂ سجدہ کے متعلق فرمایا ہے:

"چنانچہ تفصیل آں دفعات، در سورۂ سجدہ مذکور است، و در تفسیر فتح العزیز شرح آں بوجہ مستوفی مذکور شد" (۴)

(ج) سورۂ مؤمنون کی آیت: ۳۱ کے لیے تحریر ہے:

"من تفسیر فتح العزیز تحت قولہ تعالیٰ فی سورۃ المؤمنین ثم أنشأنا من بعدھم قرناً آخرین" (۵)

(د) اسی طرح سورۂ صافات کی آیت: ۱۷۱، ۱۷۲ کے ضمن میں ہے:

"أیضا منها من سورۃ الصافات من باب أسرار القصص تحت قولہ

ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انہم لہم المنصورون‘‘(۶)

ان اقتباسات سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں کہ:

شاہ صاحب نے قرآن کریم کی ایک مکمل تفسیر تحریر فرمائی تھی، جس میں سے سورۂ نساء، سورۂ ہود، سورۂ مؤمنون، سورۂ سجدہ اور سورۂ صافات سے بعض اقتباسات شاہ صاحب نے اپنے فتاویٰ میں نقل کیے ہیں۔

مذکورہ اقتباسات میں فتح العزیز کا نام آیا ہے، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ معروف تفسیر فتح العزیز کی تالیف سے قبل جو تفسیر تالیف فرمائی تھی اس کا نام بھی فتح العزیز ہی رکھا ہو، اس تفسیر کے کمیاب ہونے کی وجہ سے بعد میں یہ نام غیر معروف ہو گیا ہو۔ جس طرح آج حضرت شاہ صاحب کی فتح العزیز کے علاوہ کوئی اور تفسیر متعارف نہیں ہے، اسی طرح اس وقت بھی شاہ صاحب کی قدیم تفسیر ناپید و کمیاب ہوگی، اس لیے شاہ صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ میں نے تفسیر کی فلاں سورۃ میں یہ بات لکھی ہے، اس سے اکثر پڑھنے والوں اور اہل علم کا ذہن فتح العزیز کی طرف گیا، مگر ان کے یہ اقتباسات، عبدالرحیم ضیا کی اس اطلاع کی تصدیق کررہے ہیں کہ شاہ صاحب نے ایک تفسیر مکمل قرآن کریم کی تحریر فرمائی تھی، جس کی یہ چند عبارتیں فتاویٰ عزیزیہ میں ضمناً آ گئی ہیں۔

ضرورت ہے کہ شاہ صاحب کی اس پرانی تفسیر کو تلاش کیا جائے اور اس کے تعارف اور طباعت کا اہتمام ہو۔

ڈاکٹر ثریا ڈار صاحبہ نے اس تفسیر، تفسیر فتح العزیز اور تکملۂ تفسیر فتح العزیز، تینوں کے متعلق اس طرح لکھا ہے، کہ تینوں باتیں خبط ہو گئیں اور ان کی اطلاعات بھی مشتبہ ہو گئیں۔(۷) جس کی تصحیح و تفصیل یہ ہے۔

فتح العزیز سے پہلے لکھی گئی تفسیر کے بارے میں عبدالرحیم ضیا کے الفاظ یہ ہیں:

’’حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک تفسیر فارسی تمام قرآن مجید کی اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے، مگر وہ چھپی نہیں‘‘(۸)

اس کا صاف مطلب ہے کہ یہ تفسیر تفسیر فتح العزیز کے علاوہ تھی، کیوں کہ تفسیر فتح العزیز ۱۲۴۸ھ (۳۳-۱۸۳۲ء) میں چھپ چکی تھی اور اس کے بعد ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) تک کئی مرتبہ

شائع ہوچکی تھی۔

وجہ تالیف: شاہ صاحب کی عصر کے بعد ایک مجلس عام منعقد ہوتی تھی جس میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی حاضر ہوتے اور فائدہ اٹھاتے تھے۔اس مجلس کے غیر مسلم شرکا میں شاہ عالم کے دربار کے ایک کائستھ ملازم بھی تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی وہ مشرف بہ اسلام ہوگئے، شاہ صاحب نے ان کا نام مصدق الدین (۹) رکھا۔عبدالرحیم ضیا لکھتے ہیں:

> ''تفسیر فتح العزیز کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ آپ کی ایام جوانی میں عادت تھی کہ بعد نماز عصر تشریف رکھتے، اخبار دیار وامصار کی گوش زد ہوتی، دوسرے سخن و قصص بھی درمیان آتے اور اشخاص اسی قسم کے جمع ہوتے تھے، چنانچہ ایک کائستھ بھی درباریوں سے بادشاہ شاہ عالم کے اسی وقت حاضر ہوکر قصص دربار عرض کرتا، آخرکار وہ کائستھ فیض صحبت سے مسلمان ہوکر مصدق الدین نام پایا اور کمال کو پہنچا، انہیں کے حسب استدعا ۱۲۰۸ھ میں تفسیر شروع ہوئی۔''(۱۰)

خود شاہ صاحب نے بھی تفسیر کی ابتدا میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے:

> ''امابعد! این معتل الذات، ناقص الفکر، اجوف الباطن، چوں حرف ترخیم سقط و مانند الف وصل گمنام، معرا از شعور وتمیز، مسمی بعبد العزیز غفر اللہ ذنوبہ وستر عیوبہ! کہ اگر نظر باتصال صوری درمقام تعریف نسب خود بگوید، میتواند گفت کہ ابن لسان العرفان، ترجمان القرآن، خاتمۃ المحدثین، وارث علوم سید المرسلین، حکیم امت مصطفویہ، معجزۂ از معجزات نبویہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی وابن الابن صاحب الحالات السنیۃ والمقالات العلیۃ قدوۂ اہل سلوک وعرفان، جامع جذب واحسان، حضرت شیخ عبدالرحیم دہلوی است
>
> أعلی اللہ درجاتہما فی أعلی علیین وحشرھما فی زمرۃ الشھداء والصدیقین۔
>
> امانظر بفقدان نسبت معنوی می ترسد کہ چوں دود وو عاء آتش وچوں کرم ننگ آب نکرد، ودرسنہ یک ہزار ودوصد وہشت از ہجرت مقدسہ نبویہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ والف الف تحیۃ، بجاذبہ شوق وداعیہ عزم برادر دینی، جوہر نتیجہ حق گزینی، سالک راہ خداجوئی، ملازم طریقہ صدق گوئی، مقبول جناب عالی، آفتاب خلائق مآب، مولانا

وبالفضل اولانا، فخر الملۃ والدین محمد، قدس اللہ سرہ الامجد، شیخ مصدق الدین عبداللہ وفقہ اللہ کما یحبہ ویرضاہ وعاملہ باللطف والإحسان فی أولاہ وآخراہ، کہ اولاً برائے ایضاح معانی سورۂ فاتحۃ الکتاب، ودوسی پارہ آخرین، از حضرت قرآن مجید نفعنا اللہ بآیاتہ فی الدنیا والآخرۃ کہ اکثر مسلمین در صلوٰات خمسہ وجمع وجماعات و محاضر ارواح مقدسہ انبیاء واولیا وزیارت قبور صلحا وعرفا، بتلاوت ایں سورہا تشرف و استسعاد می نمایند و تعطش بدریافت مضامین آنہا بہم می رسانند"۔

تفسیر فتح العزیز شاہ صاحب نے املا کرائی تھی، جیسا کہ شاہ صاحب نے خود تحریر فرمایا ہے اور شیخ مصدق الدین (۱۱) نے اس کو محفوظ اور قلم بند کیا تھا۔ شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ:

"وآں برادر دینی لفظ بلفظ او را در سلک تحریر کشیدند۔" (۱۲)

ترجمہ: اور اس کو وہ دینی بھائی (شیخ مصدق الدین) لفظ بہ لفظ تحریر میں لاتے اور محفوظ کرتے تھے۔

تفسیر فتح العزیز کی ترتیب اور اس کے مختلف حصے: شاہ صاحب کی تمہید سے یہ بھی صاف ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اول اور آخری پاروں کی تفسیر املا کرائی، اس کے بعد پارۂ الم، اور تقریباً ایک چوتھائی پارہ سیقول کی تفسیر بھی تحریر و مرتب ہوئی۔ اس کی تمہید میں ہے:

"اولاً برائے ایضاح معانی سورۂ فاتحۃ الکتاب ودوسی پارہ آخرین از حضرت قرآن مجید نفعنا اللہ بآیاتہ فی الدنیا والآخرۃ کہ اکثر مسلمین در صلوات خمسہ و جمع جماعات ومحاضر قدسیہ انبیا، اولیا، وزیارت قبور صلحا وعرفا بتلاوت ایں سورہا تشرف و استسعاد می نمایند وثانیاً سورۂ بقرہ"۔ (۱۳)

ترجمہ: سب سے پہلے سورۂ فاتحہ کے مضامین کی وضاحت کی گئی اور دو تین پارے آخر کے حضرت قرآن مجید کے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی آیات شریفہ سے دنیا وآخرت میں نفع پہنچائے (کہ تفسیر لکھی گئی) کیوں کہ اکثر مسلمان پانچوں نمازوں، جمعہ، جماعات اور انبیا علیہم السلام کے مبارک تذکروں اور اولیائے کرام کے ایصال ثواب، نیک بندوں کی قبروں کی زیارت اور اپنے جاننے والوں کے لیے، ان سورتوں کی تلاوت سے برکت اور سعادت حاصل کرتے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ شاہ صاحب نے فتح العزیز کی ابتدا آخری پاروں سے کی تھی جو عام

پڑھنے والوں، خصوصاً نومسلم شیخ مصدق الدین کے لیے زیادہ مفید ہو، آخر کے تینوں پاروں کی تفسیر سے فراغت کے بعد اوائل قرآن پر توجہ فرمائی، مگر یہ سلسلہ دور تک نہیں چلا، وجہ کیا ہوئی؟ واضح نہیں! اب تفسیر فتح العزیز یا تفسیر عزیزی کا اسی قدر حصہ (اتنے ہی پارے) موجود ہیں، اس سلسلہ میں بعض اہل علم نے کئی باتیں کہی ہیں اور مختلف احتمالات بیان کیے ہیں، مگر میرے ناچیز خیال میں وہ سبھی باتیں نا قابل التفات ہیں۔ بعض اصحاب نے تفسیر عزیزی کے مزید حصوں کی معلومات کے طور پر اس اشاعت کا تذکرہ کیا ہے جو امام الدین نامی حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایک گمنام شاگرد اور محفل درس قرآن مجید میں مسلسل حاضر رہنے والے خادم نے ۱۲۵۹ھ میں مرتب کی تھی۔ اس درس کا ایک حصہ جو سورۂ مؤمنون سے والصافات تک سورتوں کی تفسیر پر مشتمل ہے، مطبع انصاری دہلی سے چھپا تھا، مگر وہ شاہ صاحب کے درس قرآن کی باقیات ہیں، تفسیر عزیزی کی نہیں۔

تفسیر فتح العزیز کے خطی نسخے، طباعتیں اور ترجمے: تفسیر فتح العزیز فارسی میں ہے، جس وقت سے اس کا املا شروع ہوا اسی وقت سے اس کی نقلیں لوگوں نے لینی شروع کر دی تھیں، ہند پاکستان اور یورپ کے کتب خانوں میں اس کے پچاسوں قلمی نسخے موجود ہیں جس میں سے متعدد حضرت مصنف کی حیات کے لکھے ہوئے ہیں لیکن مجھے کسی ایسے نسخہ کا علم نہیں جو نقل کے بعد حضرت مصنف کی نظر سے گذرا ہو یا اس پر ان کے قلم سے اجازت ہو۔ اس کا جو قدیم ترین نسخہ میرے علم میں ہے وہ مولانا نواب صدیق حسن خاں کے والد مولانا سید اولاد علی قنوجی کے قلم سے ہے، یہ نسخہ پانچ سو چودہ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۲۳۸ھ (۲۳-۱۸۲۲ء) کا لکھا ہوا ہے، کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں محفوظ ہے۔ (۱۴)

ایک اور خطی نسخہ جس کی شاہ محمد اسحاق کے فاضل شاگرد، مولانا نورالحسن کاندھلوی (وفات: ۱۲۸۵ھ) نے ایک معتبر قلمی نسخہ سے تصحیح کی تھی، ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے، مگر افسوس کہ اس پر نہ اصل نسخہ کا سنہ کتابت درج ہے اور نہ مولانا نورالحسن کے مقابلہ اور تصحیح کا ذکر ہے۔

ایک اور نسخہ: تفسیر فتح العزیز کا ایک اور اچھا نسخہ جو پارۂ عم کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس کی نقل حضرت شاہ محمد اسحاق کے شاگرد مولانا عبدالمجید خاں (ابن دولت علی خاں) جلال آبادی کے ایک شاگرد وزیر محمد خاں ساکن موضع لوہاری متصل جلال آباد (مظفر نگر، یوپی) نے حضرت شاہ محمد اسحاق کے مدرسہ میں اپنے قیام کے وقت محرم الحرام ۱۲۵۸ھ (مارچ ۱۸۴۲ء) میں مکمل کی تھی۔ یہ نسخہ لائق استفادہ ہے،

مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد (مظفر نگر، یوپی) کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

پہلی طباعت: پہلی طباعت جو صرف انتیسویں پارہ (سورۂ ملک سے سورۂ مرسلات) پر مشتمل ہے۔ نور علی خاں، میر داد علی اور میر حسین بخش کے تعاون و اہتمام سے دارالامارت کلکتہ سے شاہ صاحب کی وفات ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۴ء) کے صرف نو سال بعد ۱۱؍ شوال ۱۲۴۸ھ (مارچ ۱۸۳۳ء) میں عمل میں آئی۔

اس کی تصحیح و طباعت میں مدرسہ عالیہ کلکتہ اور ایشیاٹک سوسائٹی کے ممتاز ترین علما اور محققین شامل تھے، جن کے اسمائے گرامی خاتمۃ الطبع میں درج ہیں۔ یہ حضرات مولانا حافظ احمد کبیر، مفتی مولوی محمد مراد، مولوی عجیب احمد، مولوی منصور احمد، مولوی محمد مرتضی، مولوی ظہیر علی، مولوی بدرالدجی اور مولوی محی الدین تھے، (۱۵) یہ نسخہ بڑی پیمائش کے ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، نستعلیق کی ٹائپ کی طباعت ہے، آخری دو صفحات میں خاتمۃ الطبع اور حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات پر ایک مفصل قطعۂ تاریخ شامل ہے۔ اس کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔ (۱۶)

طبع دوم مطبع احمدی، کلکتہ ۱۲۴۸ھ: کلکتہ سے تفسیر کی پہلی طباعت کے تقریباً ساتھ ہی، تفسیر فتح العزیز کا آخری حصہ، پارہ ۲۹ و ۳۰، سید عبداللہ خلف سید بہادر علی نے بھی (جو شاہ صاحب کے متوسلین میں سے تھے) اپنے مطبع احمدی سے شائع کیا۔ اس طباعت کے آخری دونوں پارے علاحدہ چھپے ہیں، پہلے تیسواں پارہ چھپا تھا، بعد میں انتیسواں پارہ (تبارک الذی) چھپا، اس کے خاتمۃ الطبع میں لکھا ہے:

> "بعد طبع تفسیر سیپارہ سی ام (عم یتساء لون) بفتح العزیز، سیپارہ بست و نہم (تبارک الذی) از تفسیر موصوف بتاریخ غرہ شہر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ از فضل حق سبحانہ و تعالیٰ بہ طفیل جناب سید الانبیا، شافع روز جزا و ائمہ ہدیٰ، خلفاء مقتدی صلی اللہ علیہ وسلم در مطبع احمدی واقع شہر چچرہ و متعلقہ ضلع ہوگلی بہ تصحیح ایں ذرہ بے مقدار بل لاشئ فی الاعتبار، اعنی خیر خواہ خلق اللہ خاکسار عبداللہ سید بہادر علی مرحوم بہ طبع رسید۔" (۱۷)

ترجمہ: تفسیر فتح العزیز کے تیسویں پارہ (عم یتساء لون) کی طباعت کے بعد اسی تفسیر کا انتیسواں پارہ (تبارک الذی) یکم ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ (۲۴؍ مارچ ۱۸۳۳ء) حق تعالیٰ شانہ کے فضل و کرم اور حضرت سید الانبیا، شافع روز جزا، صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ ہدی اور اس حضرت کے رہنما خلفا کے طفیل میں مطبع احمدی جو شہر چچرہ

میں واقع ہے اور ہوگلی کے متعلق ہے، اس ذرۂ بے مقدار، ناچیز وکمترین، خاکسار عبداللہ ولد سید بہادر علی مرحوم کے ذریعہ شائع ہوا۔

دیگر طباعتیں: ایک اور پرانی طباعت جو سورۂ فاتحہ سے آیت شریفہ: ''وان تصوموا خیر لکم إن کنتم تعلمون'' تک ہے، مطبع محمدی (محل وقوع درج نہیں، غالباً بمبئی ہے) صفر ۱۲۶۴ھ (فروری ۱۸۴۸ء) کی ہے، یہ بڑے سائز کے ۴۳۸ صفحات پر مشتمل ہے، خاتمۃ الطبع وغیرہ درج نہیں۔

اردو ترجمے: تفسیر کے اردو میں کئی ترجمے کیے گئے، تین ترجموں کا مجھے علم ہے۔

الف: پہلا اردو ترجمہ جو صرف تیسویں پارہ (پارۂ عم) پر مشتمل ہے، یہ ترجمہ محمد علی بن محمد حسین روگھے صاحب بمبئی کی فرمائش پر محمد حسن خاں مصطفی آبادی، رامپوری نے کیا تھا جس کا آغاز ربیع الاول کے درمیانی عشرہ ۱۲۶۱ھ میں ہوا اور ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۶۱ھ (اکتوبر ۱۸۴۵ء) کو مکمل ہو کر مطبع محمدی بمبئی سے محمد حسین اور مولوی محمد صادق کے اہتمام سے چھپا۔

یہ اشاعت بڑے سائز کے کل ۴۶۸ صفحات پر مشتمل ہے، شروع میں تین صفحات کا دیباچہ ہے، تقریباً آٹھ صفحات میں فہرست عناوین اور چار صفحات پر مشتمل تصحیح الاغلاط ہے۔

محمد حسن خاں مصطفیٰ آبادی نے پارہ انتیس (پارہ تبارک الذی) کا ترجمہ کیا تھا، دونوں طباعتوں میں فرق یہ ہے کہ پارہ تیس کا ترجمہ مطبع محمدی بمبئی سے ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵-۴۶ء) میں اور پارہ انتیس کا ترجمہ اسی مطبع سے آئندہ سال ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں شائع ہوا، اس کی وضاحت مہتاب پریس دہلی کی طباعت (۱۳۴۷ھ) میں اس طرح ہے:

> ''محمد حسن خاں مصطفی آبادی عرف رامپوری خدمت میں برادران دیندار اور محبان تقویٰ شعار کی عرض کرتا ہے کہ قبل ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵-۴۶ء) میں جب تفسیر فتح العزیز فارسی کے سیپارہ عم کا ترجمہ بموجب حکم ـــــ محمد علی بن محمد حسین کے بزبان ہندی عام فہم چھپ کر شائع ہوا تو ہر شخص بکمال شوق و رغبت کہنے لگا کہ اگر سیپارۂ تبارک الذی کی تفسیر بھی مثل اس کے سلیس ہندی میں ترجمہ ہو کر چھپ جائے تو دین کا بڑا فائدہ ہو اور ہم لوگوں کی بخوبی سمجھ میں آئے۔ الحمدللہ کہ حسب اشارہ و حسن نیت جناب موصوف کے ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں اس کا ترجمہ بھی مطبع محمدی میں چھپنا

شروع ہوگیا۔‘‘(۱۸)

اس ترجمہ کی دوسری طباعت: اس ترجمہ کی دوسری طباعت، مطبع مصطفائی لکھنؤ سے ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) میں آئی، تمہید کے آخر میں جلی حروف میں لکھا ہے:

’’ایں تفسیر اول بار در بمبئی طبع شد، و بار دیگر محمد مصطفی خاں خلف حاجی محمد روشن خاں لکھنؤ طبع نمود ۱۲۶۷ھ۔‘‘

یہ بڑے سائز کے ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، شروع کے تین صفحات میں فہرست مضامین بھی شامل ہے۔

مطبع فاروقی دہلی کی اشاعت: تفسیر فتح العزیز کے ابتدائی حصے، سورۂ فاتحہ، بقرہ (ربع سیقول تک) کے جو اردو ترجمے بمبئی اور دہلی سے چھپے اور بار بار چھپے، ان میں بعض آیتوں اور کلمات کا ترجمہ رہ گیا تھا، زبان و بیان پر بھی نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، اس لیے مطبع فاروقی کے مالک مولوی محمد معظم صاحب نے اس ترجمہ پر مکمل نظر ثانی کا ارادہ کیا اور اس کے لیے مولوی محمد عرفان ٹونکی اور مولوی میر احمد خاں پشاوری کو متعین کیا، دونوں نے پورے ترجمہ پر نظر ثانی کی، ناقص عبارتوں کو پورا کیا اور زبان کی بھی تصحیح و تزئین فرمائی۔ یہ ترجمہ جس کو ابتدائی پاروں کا مکمل ترجمہ کہنا چاہئے ربیع الاول ۱۳۱۲ھ (ستمبر ۱۸۹۴ء) میں مطبع فاروقی سے شائع ہوا۔ مولوی محمد معظم نے خاتمۃ الطبع میں لکھا ہے:

’’مولانا سید عرفان صاحب ٹونکی و ارباب مولوی میر احمد خاں صاحب پشاوری محاورات ترجمہ اردو، اکثر وہ عبارات جن کا ترجمہ رہ گیا تھا درست کرا کے ملحوظ کر دیے گئے۔‘‘

اس طباعت کے حاشیوں پر ص ۶۶۵ تک تفسیر خلیلی (مجھے اس کے مصنف وغیرہ کا علم نہیں) اور ص ۶۶۶ سے آخر تک شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کا موضح قرآن بھی ہے۔

یہ طباعت درمیانہ سائز کے ۹۶۴ صفحات پر مشتمل ہے، سورۂ فاتحہ اور پارۂ الم کے سات سو صفحات ہیں، پارۂ سیقول ایک سو چونسٹھ صفحات میں ہے۔

ایک اور ترجمہ۔ بستان التفاسیر از مولانا محمد علی چاندپوری: یہ ترجمہ بھی سورۂ فاتحہ سے پارہ سیقول کی آیت: ’’وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون‘‘ تک ہے۔ پارۂ الم کا ترجمہ مولانا محمد علی چاندپوری کے قلم سے ہے اور پارہ سیقول والا حصہ مولانا سید ہاشم علی کا ہے۔ یہ ترجمہ دو حصوں

میں ۱۲۸۳ھ (۶۷-۱۸۶۶ء) میں مطبع مصطفائی دہلی سے جناب محمد حسین خاں کے اہتمام سے شائع ہوا تھا، پہلا حصہ آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے، ترجمہ پارہ سیقول کے ایک سو چونسٹھ صفحات ہیں۔

ترجمہ بستان التفاسیر کی ایک اور طباعت: یہ ترجمہ بار بار چھپتا رہا، ان میں سے ایک اشاعت قاضی عبدالکریم کے اہتمام سے مطبع نامی کریمی بمبئی سے ۱۳۱۶ھ (۹۹-۱۸۹۸ء) میں آئی تھی۔

بڑی ناپ کے کل ۵۷۸ صفحات ہیں، جس میں سورۂ فاتحہ و پارۂ الم ۴۹۶ تک ہے اور پارۂ سیقول بیاسی ۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبع فاروقی دہلی اور مطبع نامی کریمی بمبئی کی، دونوں طباعتوں میں، سورۂ فاتحہ و پارۂ الم کا ترجمہ، مولانا محمد علی چاندپوری کے قلم سے ہے اور پارۂ سیقول مولانا سید ہاشم علی دہلوی کا ترجمہ ہے۔

دہلی اور ممبئی کی طباعتوں کے علاوہ، مطبع محمدی اور گلزار محمدی لاہور مطبع مجتبائی دہلی اور لکھنؤ کے مطابع سے بھی فارسی و اردو دونوں ترجمے برابر چھپتے رہے اور اب بھی ان کے عکس شائع ہوتے رہتے ہیں، ان طباعتوں میں سے ایک عمدہ طباعت مطبع نظامی کانپور ۱۳۰۶ھ (۸۹-۱۸۸۸ء) کی ہے، جو ۲۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

عربی ترجمے: تفسیر فتح العزیز کا عربی میں بھی ایک ترجمہ ہوا تھا، یہ ترجمہ جنوبی ہندوستان میں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر راہی فدائی صاحب نے لکھا ہے کہ:

> ”چوں کہ اس علاقہ کے لوگ فارسی زبان سے ناواقف تھے، اس لیے وہاں کے علما نے ضرورت محسوس کی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے علوم و افادات سے جنوب کے لوگ بھی فیض یاب ہوں، اس لیے مولانا ارتضا علی خاں گوپاموی نے جو جنوب میں مقیم اور وہاں کے علما میں مقبول تھے، مولانا شیخ عبدالقادر آ توری جو جنوب کے مشہور دارالعلوم باقیات الصالحات کے بانی کے والد تھے، سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ فتح العزیز کا عربی میں ترجمہ کریں، اس لیے مولانا عبدالقادر نے ۱۲۴۹ھ (۳۴-۱۸۳۳ء) میں تفسیر عزیزی کا ”التعریب القادری للتفسیر العزیزی“ کے نام سے عربی ترجمہ فرمایا۔ اس ترجمہ کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں جو فارسی کے اشعار موقع بہ موقع آئے ہیں، مترجم مولانا آ توری نے ان کا بھی عربی میں ترجمہ کیا ہے جس سے

ان کی دونوں زبانوں پر قدرت کا علم ہوتا ہے۔

یہ ترجمہ آخری دو پاروں کا ہے، مولانا عبدالرحیم آتوری جو شاہ عبدالوہاب قادری (بانی باقیات الصالحات ویلور) کے پوتے تھے اور ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے، چاہتے تھے کہ یہ ترجمہ چھپ جائے۔اس کے لیے ایک مفصل خط مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند کو لکھا تھا مگر غالباً اس کی طباعت نہیں ہوسکی، اس وقت تک اس کے مطبوعہ نسخہ کا علم نہیں، اس کا ایک خطی نسخہ باقیات الصالحات میں ہے۔''(۱۹)

تفسیر فتح العزیز کا منظوم اردو ترجمہ: تفسیر کے نثری ترجموں کے علاوہ ایک ترجمہ منظوم بھی ہوا تھا جس کا نام نور اسلام تھا، کل چھ سو چھیاسٹھ اشعار پر مشتمل یہ ترجمہ چھپا نہیں، اس پر مترجم نے اپنا نام بھی درج نہیں کیا۔اس کا آغاز اس طرح ہے:

جناب مولوی معنوی نے شاہ عبدالعزیز دہلوی نے
عزیزیہ جو ہے تفسیر مشہور کیا ہے اس میں یوں ہی اس نے مذکور (۲۰)

النظر علی الفتح العزیز: یہ حضرت شاہ ولی اللہ کے مشہور شاگرد اور ممتاز مصنف مولانا رفیع الدین بن فریدالدین مرادآبادی وفات ۱۲۲۳ھ (۹۔۱۸۰۸ء) کی تالیف ہے، یہ نسخہ ۱۲۴۸ھ (۳۳۔۱۸۳۲ء) کا مکتوبہ اور ایک سو اکتیس صفحات پر مشتمل ہے، اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے۔

خلاصہ تفسیر عزیزی: تفسیر عزیزی کا فارسی میں ایک خلاصہ بھی مرتب ہوا تھا، یہ خلاصہ بہادر علی دہلوی نے کیا تھا جو فل اسکیپ سائز کے ۴۷ اوراق پر مشتمل ہے، اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ وأصحابہ اجمعین''۔

''باید دانست کہ ایں چند سطور از تفسیر عزیزی اقتباس نمودہ شد کہ موجب ادراک بعضے نکات قرآن مجید گردد''۔

یہ خلاصہ صرف انتیسویں، تیسویں پارہ (پارۂ تبارک الذی وعم) کا ہے، ملخص نے اس کا آغاز سورۂ ملک کے تفسیری نکات سے کیا ہے۔اس کی تالیف شعبان ۱۲۴۸ھ (جنوری ۱۸۳۳ء) میں مکمل

ہوئی۔ترقیمۂ کاتب میں اس کی صراحت ہے:

”الحمد للہ والمنۃ للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وأصحابہ وتبعہ أجمعین، ایں خلاصہ تفسیر عزیزی، عجالۃ الوقت در امیر گنج بتاریخ دہم شہر شعبان المعظم ۱۲۴۸ھ قدسی بعون الٰہی و ببرکت انوار محمدیہ کہ ہمہ افراد آدم وجمیع کائنات عالم خصوصاً باور دارندۂ احکام ایں شریعت محکوم را لازم اند و وجود ظاہری عبارت از آں است، باختتام رسید۔“

اس عبارت کے حاشیہ پر لکھا ہے:

”خاکسار خادم العلما بہادر علی دہلوی (۲۱) کان اللہ لہ فی الدارین۔“

یہ نسخہ رضا لائبریری، رامپور میں محفوظ ہے۔(۲۲)

تکملہ تفسیر فتح العزیز؟: متعدد تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ شاہ صاحب کے ایک ممتاز فاضل و متبحر شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی نے تفسیر کا مفصل تکملہ لکھا تھا جو ستائیس جلدوں پر مشتمل تھا، جس کی پہلی اطلاع خود مولانا حیدر علی صاحب نے اپنی کتاب إزالۃ الغین عن بصارۃ العین میں دی ہے اور عبدالرحیم ضیا حیدرآبادی نے بھی مقالات طریقت میں یہی لکھ دیا ہے کہ مولانا حیدر علی نے تفسیر فتح العزیز کا تکملہ ستائیس جلدوں میں کیا مگر یہ اطلاعات وضاحت و تفصیل چاہتی ہیں۔ جو کتاب مولانا حیدر علی نے لکھی تھی اور تکملہ فتح العزیز کے نام سے معروف ہے وہ دراصل شاہ صاحب کے درس قرآن کا تحریری پیرہن ہے، یہ علاحدہ تصنیف ہے اور نہ ہی فتح العزیز کا تکملہ! اس کا مفصل تذکرہ اور اس کے دریافت نسخوں کا تعارف درس قرآن کے تحت آرہا ہے۔

مولانا حیدر علی نے إزالۃ الغین عن بصارۃ العین میں لکھا ہے:

”کہ میں نے تفسیر فتح العزیز کا تکملہ ستائیس جلدوں میں لکھا ہے۔“(۲۳)

اس کی کچھ تفصیل عبدالرحیم ضیا نے مقالات طریقت میں بیان کی ہے، لکھتے ہیں کہ:

”مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو حضرت کے اخیر وقت کے مستفیضوں سے ہیں، حسب خواہش سکندر بیگم مغفورہ والیۂ بھوپال تفسیر مذکور کا تکملہ ستائیس جلدوں میں کیا ہے، راقم نے دیکھا ہے بہت خوب لکھا ہے۔ اس عصر

میں ایسی استعداد ولیاقت کی فرد نایاب ہے، دوسرے کا منھ نہیں جو یہ ہمت کر سکے، مگر دونوں کا فرق دیکھنے والا اپنے حوصلہ کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔"(۲۴)

عبدالرحیم ضیا اور تذکرہ نگاروں کی اطلاعات سے خیال ہوتا ہے کہ یہ تکملہ مولانا حیدر علی صاحب کی تصنیف ہے، مجھے اس اطلاع کی تصدیق میں بوجوہ تامل رہا کہ بلاشبہ مولانا حیدر علی صاحب بہت بڑے عالم تھے، مگر ایسا بھی کیا کہ نواب سکندر جہاں بیگم کی فرمائش پر انھوں نے صرف دو، سوا دو سال کے عرصہ میں ستائیس جلدیں تحریر فرمادیں۔ اس کتاب کے نسخۂ مصنف تک رسائی ہوئی تو یہ عقدہ حل ہوا کہ مولانا حیدر علی کی یہ ایک بہت بڑی علمی یادگار جو تکملہ فتح العزیز کے نام سے معروف ہے دراصل شاہ صاحب کے درس قرآن کی وہ تقریر ہے جس کو مولانا حیدر علی نے درس میں قلم بند کیا تھا وہی تقریر مکمل ہوکر تکملہ فتح العزیز کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس کی وضاحت اِفادات درس شاہ عبدالعزیز کے پہلے صفحہ پر درج کلمات سے ہورہی ہے۔ خود مولانا حیدر علی نے اس کی وضاحت کی اور اپنے فرزند کو اس کی ہدایت کی کہ میرے یہ الفاظ اس کتاب کے پہلے صفحہ پر لکھ دو۔ مولانا کے صاحبزادہ نے تحریر کیا ہے کہ:

"ایں کتابیست کہ بزرگے درعین وعظ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ وأنار اللہ برہانہ ملفوظات متبرکہ رامی نوشت۔"

ترجمہ: یہ ایک کتاب ہے جس کو ایک بزرگ نے حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کے وعظ (درس قرآن) کے دوران ان کے الفاظ کے مطابق لکھا ہے۔

اس کے نیچے مزید تاکید کے لیے ایک عبارت اور لکھی ہے:

"ایں عبارت مولوی حیدر علی لکھنوی از ولد خود روبرویم تحریر کنانیدہ اند۔"

ترجمہ: یہ عبارت مولانا حیدر علی لکھنوی نے اپنے بیٹے سے اپنے سامنے لکھوائی تھی۔

اس کے بعد ان الفاظ میں دستخط کیے گئے ہیں۔ محمد علی عفی عنہ وعن والدیہ، اس کے بعد ایک مختصر عبارت میں جو اردو میں ہے۔ لکھا ہے:

"تصنیف مولوی حیدر علی لکھنوی شاگرد شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم، اس تفسیر کو مصنف نے شاہ صاحب کے وعظ کو سن کر قلم بند کیا ہے۔"

اس نسخہ کی پیشانی یا پہلے ورق پر ایک فقرہ یا عبارت اور درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تکملہ کا یہ نسخہ ٹونک کے نواب صاحب یا کسی بڑے رئیس نے دہلی سے خریدا تھا۔لکھا ہے:

"تکملہ فتح العزیز از مولوی حیدر علی صاحب لکھنوی، صاحب منتہی الکلام، خط فارسی، کاغذ سفید، آوردہ حضور از دہلی"

ان تصریحات کے بعد نسخہ کو دیکھیے، پڑھیے تو آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں کہ وہ کیا لوگ تھے جو ایسے بڑے بڑے کارنامے انجام دے گئے۔

تکملہ ٔفتح العزیز کا نسخہ ٔ مؤلف بہت کچھ کہتا ہے، اس کی تحریر ایسی پاکیزہ اور صاف ہے کہ اچھے خطاطوں بلکہ کمپیوٹر کے لیے بھی ایسا مسلسل لکھنا مشکل ہے، الفاظ میں، تحریر میں، سطور کے فاصلہ میں عجب توازن اور یکسانیت ہے، تمام حروف ایک جیسے، تمام سطریں اور سطروں کے برابر کے فاصلے بھی یکساں ہیں۔تقریر کے دوران ایسی رواں، خوبصورت اور مسلسل تحریر لکھنے کو عجوبہ کہیے یا شاہ صاحب کی کرامت! عموماً، کوئی لفظ لکھ کر نہ قلم زد کیا گیا اور نہ تبدیل ہوا، جو شاہ صاحب کی زبان حق ترجمان سے نکلا وہ کاغذ پر نقش ہوتا چلا گیا، کسی نے کہا تھا:

اُدھر کہتا گیا وہ اور اِدھر آتا گیا دل میں

یہاں دل میں تو اتر ہی رہا تھا، ساتھ میں صفحات اور کاغذ پر بھی اسی طرح نقش ہو رہا تھا، سبحان اللہ!

مگر یہ بات توجہ طلب ہے کہ کیا شاہ صاحب فارسی میں درس و تقریر فرماتے تھے، کیوں کہ اس وقت دلّی کی بول چال کی عام زبان تو بلاشبہ اردو تھی، عوام میں اسی کا چلن تھا، فارسی تحریر و تصنیف کی زبان تو تھی لیکن عام گفتگو اور وعظ و تقریر کی نہیں، اس لیے خیال یہ ہے کہ عام بیانات اور مواعظ اردو میں ہوتے ہوں گے، اگر مولانا حیدر علی صاحب نے اردو سن کر اس کو برجستہ فارسی میں لکھا ہے تو یہ اس سے بڑھ کر کمال ہے۔

افسوس کہ نسخہ ٔ ٹونک میں آغاز تفسیر کے اوراق موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ مرتب نے اس کو کس طرح شروع کیا ہے اور اس کی ترتیب، ترجیحات اور اصول کیا کیا ہیں۔نسخہ ٔ ٹونک کی ابتدا سورۃ البقرہ کی آیت: الشھر الحرام بالشھر الحرام سے ہوتی ہے یعنی موجودہ حصہ سے پہلے کم از کم پچاس ورق یا سو صفحات اور رہے ہوں گے جو اس نسخہ میں موجود نہیں۔

نسخۂ مصنف میں فی صفحہ سترہ سطور ہیں، سطور کی تعداد اور پیمائش قطعاً یکساں ہے۔ جلد اول سورۂ بقرہ سے سورۂ نمل کی چھٹی آیت: وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى القُرآن مِنْ لَدُن حَكِيمٍ عَلِيمٍ تک ہے، یہ حصہ یا جلد اول ۱۵۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

ذخیرۂ ٹونک میں محفوظ دوسری جلد کی ابتدا میں ہے کہ یہ آخری جلد سورۂ ق سے آخر قرآن کریم تک ہے:

"الحمدلله والصلوٰة علی عبده. بسم الله الرحمن الرحیم، ایں منزل اخیر است از منازل سبعہ شروع از سورۂ قاف است وختم بر سورۃ ناس، درمیان ایں منزل شصت و چار سورت است اگر لایلف را جدا از فیل شمردہ شود و الا شصت و سہ۔"

مگر افسوس کہ ٹونک میں موجود یہ حصہ ناتمام ہے، اس کے دستیاب اوراق صرف سورۂ والذاریات (چھبیسویں پارہ کے اختتام) تک ہیں اور اس کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ سورۂ قاف کی تفسیر سو صفحات پر مشتمل ہے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

مذکورہ نسخہ کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مولانا حیدر علی کا مکتوبہ و مرتبہ درس قرآن مجید اگر مکمل صورت میں دستیاب ہوتو اس کے تقریباً تین ہزار صفحات ہوں گے یعنی تفسیر عزیزی سے تین حصہ زائد اس کی ضخامت ہوگی۔

کاش یہ درس قرآن مکمل صورت میں دستیاب ہوتا تو امت کے لیے کتنا بڑا خزانہ اور اور کیسا نادر تحفہ ثابت ہوتا۔(۲۵)

تقریر درس قرآن، مرتبہ مولانا حیدر علی، نسخۂ ندوہ لکھنؤ: مولانا حیدر علی کی مرتبہ، تقریر درس قرآن شاہ عبدالعزیز جو عموماً تکملۂ تفسیر فتح العزیز کے نام سے جانی جاتی ہے، کے دو نسخے جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہیں، شبلی لائبریری، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانہ میں بھی محفوظ ہیں، مگر عجب المیہ ہے کہ تمام جلدیں یا حصے اول آخر سے ناقص ہیں، ان کے ابتدائی صفحات موجود ہیں نہ آخری، اس لیے کاتب کا نام معلوم ہے نہ سنہ کتابت اور نہ ان کا کوئی خاص تعارف ملتا ہے لیکن ان تمام جلدوں پر جمال الدین نامی کسی شخص کی مہر ثبت ہے۔

یہ نسخہ پارہ سیقول سے والمحصنات تک چار پاروں کی تفسیر پر مشتمل ہے، مگر سنہ، کاتب کا نام اور دیگر معلومات ان جلدوں پر تحریر نہیں۔(۲۶)

افادات درس قرآن: شاہ صاحب کے ایک شاگرد و متوسل ابوالفرید امام الدین حنفی نقشبندی نے دہلی میں کئی سال رہ کر شاہ صاحب سے استفادہ کیا تھا، تعلیم حاصل کی اور کم سے کم دو مرتبہ شاہ صاحب کا مکمل درس قرآن سنا اور اس کو لکھا اور مرتب صاحب کی تصریح کے مطابق حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بیس سال بعد ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں اس تقریر کو صاف اور مرتب کرنے کا خیال ہوا۔ امام الدین صاحب نے لکھا ہے کہ:

"درسنہ یک ہزار و دو صد و پنجاہ و نہ مسودہ مذکورہ را نظر ثانی نمودم و مرۃ بعد اولی بہ تسویدش زنگ حسرت از دل احیازد۔"

مرتب نے سورۂ مؤمنون سے والصافات تک کا درس مکرر نظر ثانی کے بعد اشاعت کے لائق بنایا جس کو مولوی عبدالغفار صاحب (محلہ قدیر آباد لوہاری، ملتان) کی فرمائش پر مطبع انصاری دہلی نے شائع کیا، سنہ طباعت درج نہیں، یہ نسخہ یا حصہ بڑے ناپ کے ۲۵۶ رصفحات پر مشتمل ہے۔

خلاصہ افادات درس قرآن: حضرت شاہ صاحب کے ایک شاگرد مولانا یار محمد جہلمی نے استاد کے درس قرآن کے بعض افادات اور خاص آیات کی تفسیر محفوظ و قلم بند کی تھی جو کم سے کم ایک مرتبہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوئی تھی، اس کا ایک مطبوعہ نسخہ حکیم انیس احمد پھلتی کی اطلاع کے مطابق مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔(۲۷)

امہات کتب حدیث کی تصحیح و تعلیق: حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ:

"بندہ اب قال اللہ وقال الرسول کے علاوہ گفتگو کرنا بری جانتا ہے۔"

اسی لیے تمام اوقات یا درس قرآن کریم میں گذرتے یا درس حدیث میں یعنی شاہ صاحب نے حدیث پاک کے اکثر بنیادی متون اور ان کے علاوہ بیسیوں کتابوں کی تصحیح و تعلیق بھی فرمائی ہوگی، ان میں سے جو کتابیں یا ان کا تعارف محفوظ و موجود ہے، ان میں غالباً سب سے پہلی امام نسائی کی سنن صغریٰ کی تصحیح اور اس پر مختصر تعلیقات ہیں۔ اس نسخہ کو شاہ صاحب کے نواسہ شاہ محمد اسحاق نے مرتب کر کے اپنے دلّی کے قیام کے زمانہ میں ۱۲۵۶ھ میں شائع کرا دیا تھا۔

اس طباعت کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس کا سرورق موجود نہیں، دوسرے صفحہ پر حضرت شاہ محمد اسحاق کی سنن نسائی کی سند اور امام نسائی کا بہت مختصر حال درج ہے۔ لکھا ہے:

”یقول العبد الضعیف،خادم علماء الآفاق محمد اسحاق! أخبرنا وأجازنا شیخنا...أستاذنا الشیخ الأجل المحدث الشاہ عبد العزیز لھذا الکتاب، قال: أجازنی ھذا الکتاب والدی الشاہ ولی اللہ بن عبد الرحیم المحدث الدھلوی“۔

مگر اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ نسخہ کس خطی نسخہ پر مبنی ہے، یہ حضرت شاہ ولی اللہ کا نسخہ ہے، یا حضرت شاہ عبد العزیز کا۔

اس میں بہت سے مقامات پر قال شیخنا کے ساتھ کوئی افادہ یا صراحت درج ہے اور شیخنا سے واضح ہے کہ یہ شاہ صاحب کی جانب اشارہ ہے۔ ان حواشی میں شاہ صاحب نے مختصر حل مطالب یا کسی خاص لفظ اور مشکل کی توضیح فرمائی ہے، اس میں سے متعدد حواشی شاہ صاحب کی شان تحقیق کی نشاندہی کر رہے ہیں، مثلاً کتاب النکاح کے باب إستئذان البکر فی نفسھا میں حضرت خنسا بنت خدام پر حاشیہ میں تحریر ہے:

”خدام ضبط فی التقریب وفتح الباری ”خِدام“ وقال: بکسر الخاء والمعجمة وبالدال المھملة وضبطه فی تھذیب الأسماء واللغات بالذال المعجمة۔

وکذا قال السخاوی فی ھامش فتح الباری اعراضًا علی شیخ الاسلام (ابن حجر)۔من خط شیخنا“ (ص: ۳۸۳)

اس طرح کے تقریباً پچاس سے زائد حاشیے اور افادات، مختلف صفحات پر درج ہیں، ان کے علاوہ بھی تقریباً ہر صفحہ پر کوئی نہ کوئی حاشیہ آیا ہے، اگرچہ ان میں شاہ عبد العزیز یا شاہ ولی اللہ کے نام کی صراحت یا شیخنا کا اشارہ نہیں ہے لیکن بعض افادات کے آخر میں حضرت شاہ رفیع الدین اور شاہ ولی اللہ کے نام بھی درج ہیں، یہ حواشی حل لغات اور نحوی صرفی وضاحتوں پر مشتمل ہیں، اکثر بڑے حاشیے، امام نووی کی تہذیب الأسماء واللغات، علامہ ابن اثیر کی نہایہ، علامہ طاہر پٹنی کی مجمع بحار الانوار، حافظ ابن حجر

کی تقریب التہذیب یا علامہ سیوطی کی تحقیقات سے ہیں۔

مذکورہ بالا حاشیوں کے علاوہ، بین السطور میں بھی بعض مقامات پر نحو وصرف کی تحقیق اور اعراب وکلمات کی تعیین کی گئی ہے۔

یہ نسخہ اپنی بعض خصوصیات میں منفرد ہے، غالباً یہ واحد کتاب ہے جس کی طباعت واشاعت کا شاہ محمد اسحاق نے اہتمام فرمایا تھا۔

اس کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ امہات کتب حدیث خصوصاً صحاح ستہ میں شامل یہ پہلی کتاب ہے جو پوری دنیا میں سب سے پہلے شائع ہوئی۔ جہاں تک معلوم ہے مشرق ومغرب میں کہیں بھی حدیث شریف کا کوئی مکمل متن اس سے قبل شائع نہیں ہوا تھا۔

ہمارے ذخیرہ میں موجود سنن نسائی کے، اس نسخہ کی ہندوستان کے دو ممتاز محدثین نے مزید تصحیح بھی فرمائی ہے، اول یہ نسخہ حضرت مولانا نورالحسن کاندھلوی (۱۲۸۵ھ) کی ملکیت میں رہا، اس پر ان کی مہر ثبت ہے۔ مولانا نورالحسن حضرت شاہ محمد اسحاق کے بہت ممتاز اور فاضل شاگرد تھے، انہوں نے صحاح ستہ خصوصاً صحیح بخاری شاہ محمد اسحاق سے دو مرتبہ پڑھی اور ان کا برسوں تک مدرسہ شاہ محمد اسحاق میں قیام رہا۔

دوسرے ہندوستان کے مشہور محدث وفقیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (وفات ۱۳۲۳ھ) کے درس میں یہ نسخہ پڑھا گیا اور اس پر کثرت سے قلم سے اصلاح ودرستگی کی گئی ہے، زیادہ تر اصلاحات حاشیوں پر ہیں، بہت سے مقامات پر متن میں لفظ کو موقع پر درست کر دیا ہے۔

یہ نسخہ بڑے سائز کے (طول ۲۸ سینٹی میٹر، عرض ۲۰ سینٹی میٹر) ۶۷۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے بعد چودہ صفحوں کا غلط نامہ بھی شامل ہے، فی صفحہ ۲۵ سطریں ہیں، خط نسخ میں بہت عمدہ تو نہیں لیکن کتابت صاف ہے اور حاشیوں کے لیے جگہ کو نیلی لائن سے واضح کیا گیا ہے، پوری کتاب اسی ترتیب پر ہے۔

کتاب کے اختتام پر اس نسخہ کے سن طباعت، مطبع اور مقام طباعت کی ان الفاظ میں صراحت ہے:

”وکان الفراغ من ھذہ النسخة المبارکة المیمونة المسمّی بالنسائی

سنة ست وخمسين بعد الألف والمأتين من الهجرة النبوية على صاحبها الصلوٰة والتحية فی دار الخلافة شاہ جہاں آباد (۲۸) فی عهد بہادر شاہ"۔ (۲۹-۳۰)

تصحیح و تعلیق سنن ابوداؤد: حضرت شاہ صاحب نے سنن ابوداؤد کا بھی ایک نسخہ بڑی توجہ سے صحیح اور مکمل فرمایا تھا، یہ اصل نسخہ مولانا سید نذیر حسین کے پاس تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا تھا، مولانا سید نذیر حسین دہلوی اس کو بہت یاد کرتے تھے اور ہمیشہ اس کے ضائع ہونے پر افسوس کرتے رہتے تھے۔ مولانا شمس الحق ڈیانوی مصنف عون المعبود نے عون المعبود کے حرف اختتام میں اس نسخہ کا مفصل تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"أن الشيخ العلامة محدث الهند عبد العزيز ابن ولی الله الدهلوی قد صحح نسخة من سنن أبي داؤد وعارضها وقابلها على عدة من النسخ الصحيحة وقد حشّاها من أول الكتاب إلى آخره فلم يترك موضعاً واحداً من المواضع الصعبة من غير إيضاح ومن غير كشف۔" (۳۱)

بعد میں یہ نسخہ مولانا سید نذیر حسین صاحب کے پاس پہنچا، جہاں ۱۸۵۷ء کے حادثوں میں وہ ضائع ہوگیا، جس کا مولانا ڈیانوی نے اس طرح تذکرہ کیا ہے:

"وقد وصلت تلك النسخة الصحيحة المباركة إلى شيخنا السيد نذير حسين وقد بقيت عنده إلى أن جاء ت أيام فتنة الهند فضاع الكتاب فی تلك الفتنة ورأيته رحمه الله تعالىٰ لما يذكر قصة ضياع الكتاب يحزن كثيرًا ويتأسف تأسفًا عظيمًا ويصير مغموماً ويقول لو وجدت ذلك الكتاب عند أحد اشتريته منه بأغلى ثمن مع عجزی وفقری وقلة بضاعتی"۔ (۳۲)

افادات سنن ترمذی: سنن ترمذی صحاح ستہ کی تیسری یا چوتھی کتاب ہے، خاندان ولی اللہ میں اس کے درس و تعلّم کا سلسلہ ہمیشہ رہا، شاہ صاحب بھی سنن ترمذی کا درس دیتے تھے اور جس طرح حدیث و تفسیر کی دوسری بڑی کتابوں پر خاص توجہ فرماتے تھے، یہی کیفیت سنن ترمذی کی بھی تھی مگر

اس کے مکمل افادات پر مشتمل کسی نسخہ کا مجھے علم نہیں، جزوی افادات اس نسخہ میں درج ہیں جو شاہ صاحب کے شاگرد مولانا سید قطب الہدیٰ رائے بریلوی کا مرتبہ ومکتوبہ نسخہ ہے، انہوں نے یہ نسخہ اس وقت نقل کیا تھا جب وہ دہلی میں شاہ صاحب سے ترمذی شریف پڑھ رہے تھے۔

اس نسخہ کے آغاز پر مولانا سید قطب الہدیٰ نے حضرت شاہ ولی اللہ کی ترمذی شریف کی سند جو شیخ ابوطاہر کے حوالہ سے ہے خود شاہ عبدالعزیز کی تحریر سے نقل کی ہے، لکھا ہے کہ:

"نقل من خط أستادنا وشيخنا الشيخ عبد العزيز بن الشيخ ولی الله المحدث الدهلوی"

اس نسخہ کے بین السطور میں اور حاشیہ پر کثیر عبارات وافادات درج ہیں جس کا بڑا حصہ حضرت شاہ صاحب کے ارشادات پر مشتمل ہے، یہاں نمونہ کے طور پر صرف ایک افادہ پیش کیا جارہا ہے۔

امام ترمذی نے باب ما جاء فی فضل الطهور کے تحت حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے، جس کا ایک فقرہ یہ بھی ہے:

خرجت من وجهه كل خطيئة

اس پر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

"خروج الخطايا استعارةٌ لحصول المغفرة عند غسل العضو، لا أن الخطأ فی الحقيقة جسمٌ يخرج مختلط مع الماء، واكثرهم خصصوا تلك الخطايا بالصغائر، كما ورد فی الحديث ما اجتنب الكبائر وله توجيه آخر لا يخفی۔ مولانا عبد العزيز سلمه الله تعالیٰ"

اس نسخہ کی پہلی جلد کی کتابت عمدہ نستعلیق تحریر میں ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۲۴ھ (جولائی ۱۸۰۹ء) میں مکمل ہوئی تھی۔ (۳۳)

یہاں لکھ دینا چاہیے کہ ہمارے ذاتی ذخیرہ میں بھی صحیح بخاری کے پہلے تین پاروں پر مشتمل ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے، یہ وہ نسخہ ہے جس کو مفتی الٰہی بخش نے شاہ عبدالعزیز سے پڑھا تھا لیکن اس پر شاہ صاحب کے افادات درج نہیں۔

(جاری)

محمد ہاشم کشمی کا فارسی دیوان

(چند مخطوطات کا جائزہ)

☆ڈاکٹر عارف نوشاہی/ ڈاکٹر عطا خورشید☆☆

(۲)

اس نسخے پر جو قدیم ورق شمار لگا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مجموعے کا حصہ تھا، کیونکہ نسخے پر پہلا ورق شمار ۱۸۶ ہے اور آخری ۳۲۶، یعنی کل ۱۴۰ ورق بنتے ہیں۔ درمیان میں کچھ اوراق مفقود ہیں۔ مفقود اوراق یہ ہیں ۱۸۸، ۱۸۹، ۲۱۹، ۲۶۶، تا ۲۷۱، ۲۸۹، تا ۲۹۳، اس طرح موجود اوراق کی تعداد ۱۲۷ بنتی ہے۔ ۱۹ سطر کا مسطر ہے۔ یہ نسخہ اپریل ۱۹۶۱ء میں لاہور میوزیم لائبریری میں داخل ہوا۔ ورق ۲۴۰ ب پر میوزیم کے سابق فہرست نگار رشید احمد کے دستخط مع تاریخ ۷ جولائی ۱۹۶۹ء ثبت ہیں۔ یہ نسخہ پختہ اور واضح خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب نے سنہری جدولیں بنا کر متن اس کے اندر لکھا ہے۔ چھ مختلف مقامات پر معمولی معیار کی منقش لوحیں بھی بنائی ہیں۔ اس نسخے کی ایک خصوصیت، اس میں ۹ منیاتور (تصاویر) کا ہونا ہے جن میں مرد اور عورت دونوں موجود ہیں۔ یہ تصاویر حسب ذیل اوراق پر ہیں: ۱۸۶ ب، ۱۹۴ الف، ۲۰۴ الف، ۲۰۵ الف، ۲۰۷ ب، ۲۱۳ الف، ۲۱۸ ب، ۲۸۰ ب، ۳۲۶ ب۔ عجائب گھر کے فہرست نویس کا خیال ہے کہ یہ تصاویر گو عام معیار کی ہیں مگر ان سے پنجاب کے سِکھ دورِ زوال کی مصوری کا اندازہ ہوتا ہے۔ البتہ اس کی نقاشی اور تذہیب کاری معیار کے اعتبار سے تصویروں سے کہیں بہتر ہے۔ (انجم رحمانی، ص ۲۶)۔ مجددی سلسلے کے ایک شاعر کے دیوان اشعار میں تصاویر کا ہونا دلچسپ بات ہے۔

مشمولات: رباعیات، آیات قرآنی کی تضمین کے ساتھ، (قدیم ورق شمار کے مطابق

☆ادارہ معارف نوشاہیہ، پاکستان۔ ☆☆مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۱۸۵ب تا ۱۹۰ب)، پہلی رباعی اس مصرع سے شروع ہوتی ہیں: اکوان ہمہ پرتو انداعیان ہمہ ماہ، اس ورق کا رکابہ 'بلبل' ہے جو اگلے ورق سے نہیں ملتا یعنی درمیان سے کچھ اوراق مفقود ہیں۔ بقیہ رباعیات ورق ۱۹۰الف/ب پر ہیں۔ اس کے بعد ورق ۱۹۱الف تا ۱۹۴الف وہ رباعیات ہیں جن میں احادیث کی تضمین ہوئی ہے۔ پہلی رباعی کا پہلا مصراع یہ ہے: پرسید یکی زخواجۂ ہردوسرا۔

۲۔ نعتیہ مثنوی جس کی تاریخ تصنیف لفظ "ختم" (۱۰۴۰ھ) ہے، ورق ۱۸۶الف تا ۱۸۶ب، یہ ناقص الاول ہے اور اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

پیشۂ او باشد اسلام ای ہمام زان ہمین دو اسم آمد در کلام

۳۔ مثنوی در شان حضرت مجدّد الف ثانی، ورق ۱۹۵ب تا ۲۰۴الف۔

آغاز:

سحر خفتہ بودم در آغوش خویش برسم دل و خواب خرگوش خویش

انجام:

بحق نبی جان عین الحیات علیہ السلام و علیہ الصلوٰۃ

نسخۂ علی گڑھ میں اس شعر کے بعد بھی کئی اشعار ہیں لیکن نسخۂ لاہور میں یہ مثنوی اسی شعر پر کاتب نے ختم کردی ہے اور اس کے نیچے چھوٹی سی تصویر ہے۔ اور ورق ۲۰۵الف پر پورے صفحے پر ایک اور تصویر ہے۔

۴۔ حکایتی است در تمثیل وصول عاشق بی اعتبار بہ معشوق عالی مقدار، ورق ۲۰۵ب تا ۲۰۷ب، ایک بادشاہ کی داستان ہے جو ایک خاکروب دوشیزہ کے عشق میں مبتلا ہو کر اس کا وصال پاتا ہے۔ نسخۂ علی گڑھ میں یہ حکایت مثنوی نجم وحدت کا حصہ ہے لیکن وہاں حکایت کا الگ سے عنوان نہیں ہے۔

آغاز:

ز بعد سپاس خدای جنون پس از نعت آن رہنمای جنون

انجام:

گر این نم کہ بحرش گردد روان بود گرد من ہم رسد از کران

۵۔ مثنوی در قصہ لدھہ نامی درویش، ورق ۲۰۸ تا ۲۱۳ب۔

آغاز:

الا ای نوبہار این کہن باغ ہمی کن غنچۂ دل را گل داغ

انجام:

بنہ بر ہر بُن مو صد جہان گوش کہ از دریای لب در می زند جوش

نسخۂ علی گڑھ میں آغاز وانجام کے مذکورہ اشعار سے پہلے اور بعد میں بھی کئی اشعار ہیں۔
نسخۂ لاہور ملخص ہے۔

۶۔ترجیع بند،ورق ۲۱۴الف تا ۲۱۸ب۔

آغاز:

دَم صبح برخاست، بویی کشیم بہ صحرا گوَ زنانہ ہویی کشیم

۷۔غزلیات ردیف وار،ورق ۲۲۰ب تا ۲۸۰ب۔

آغاز:

بسمل دل ہا بود بسم اللہ عنوان ما مایۂ دیوانگی ہوی سر دیوان ما

انجام:

نہ ہاشم این ہمہ گفتی ، نہ این وآن بشنفتی حدیث شوق گر از گفت وگو برون بودی

۸۔رباعیات ردیف وار،ورق ۲۸۱ب تا ۳۱۵۔

آغاز:

ای نام تو نامۂ وجودِ من و ما از سایۂ بود تو نمودِ من و ما
منما من و مای تو از چشم نمود بر دیدہ بود نہ شہود من و ما

انجام:

زان زلف بہ پای دلم نہم زنجیری بر شورش دیوانہ کنم زنجیری
دیدم زلفی بہ خواب کو آن کہ کند این خوابِ پریشان ِ مرا تعبیری

۹۔مفردات،ورق ۳۱۶ب تا ۳۱۷ب،آغاز:

صفا سرشت چنان شد نہادِ طینت من کہ دُرد صاف برآید ز یاد طینت من

۱۰۔ قطعات بشمول قطعات تاریخ، ورق ۳۱۷ب تا ۳۲۵الف۔

۱۱۔ چہار غزل کہ دراول آن ہمان حرف آخر است در ردیف مشکل، ورق ۳۲۵ب تا ۳۲۶ب۔

نسخۂ لاہور یہاں پر ختم ہوجاتا ہے۔

ہمیں دیوان ہاشم کشمی کے دستیاب نسخوں کے باہمی تقابل کا بالاستیعاب موقع تو نہیں ملا لیکن ایک سرسری نظر سے اتنا کہہ سکتے ہیں کہ نسخۂ لاہور میں بعض نظموں کو ملخص کیا گیا ہے اور یہ دیگر نسخوں کے مقابلے میں جامع نہیں ہے۔ مثنوی در قصہ لدھہ نامی درویش کے حوالے سے ایک شعر کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ شاعر نے اسے دو طرح سے کہا ہے۔

نسخۂ لاہور:

من این طفل زبارِ غم خمیدہ گرسنہ جان سوی این خوان رسیدہ

(ورق ۲۱۱ب)

نسخۂ علی گڑھ:

کنون این طفل چون آن پیر محزون بدین نان آمدہ با قد چون نون

(ورق ۵۱ب)

اس سے یہ قیاس کرنا چاہیے کہ شاعر نے اپنے اشعار پر نظر ثانی کی ہے۔

بلا تاریخ نسخے

نسخۂ سالار جنگ ـــــ حیدرآباد (اواخر گیارہویں صدی ہجری)

یہ نسخہ سالار جنگ میوزیم و کتب خانہ، حیدرآباد (سابقہ ریاست دکن)، شمارہ A/NM809 میں ہے۔ تاریخ کتابت نہیں ہے۔ گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں لکھا گیا ہے۔ ایک مہر "محمد اشرف ۱۱۳۷" اور دوسری "عالم علی" (بلا تاریخ) اس پر ثبت ہے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ نسخہ ۱۱۳۷ھ/ ۲۵-۱۷۲۴ سے پہلے ہی کتابت ہوا ہے۔ فہرست نگار نے اسے گیارہویں صدی ہجری کے اواخر کا قرار دیا ہے۔ ۲۱۰ ورق پر مشتمل یہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ محمد اشرف نے اس نسخے کے مندرجات کی تفصیل "کلیات ہاشم" کے تحت لکھی ہے۔ (محمد اشرف، ج ۵، ص ۱۴۱-۱۴۲)

نسخۂ ندوۃ العلما لکھنو(گیارھویں صدی ہجری): کتب خانۂ ندوۃ العلما، لکھنو(شمارہ ۲۲۳۹/ ۲۰۶/) کا یہ نسخہ فہرست نسخہ ہاے خطی فارسی کتاب خانۂ ندوۃ العلما لکھنو، ص ۳۸۹، میں بطور دیوان ہاشم(نامعلوم) متعارف ہوا ہے۔ ہمیں اس نسخے کی عکسی نقل دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس کے تمام مشمولات، نسخۂ علی گڑھ، جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، جیسے ہیں جس سے محقق ہوا کہ یہ دیوان ہاشم کشمی ہے۔ ظہریہ پر باریک پنسل سے بھی ''خواجہ محمد ہاشم کشمی ف ب[فوت بعد] ۱۰۳۷'' لکھا ہے۔ نسخے میں کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں ہے لیکن خط دیکھ کر تخمینہ لگایا جا سکتا ہے کہ گیارھویں صدی ہجری میں لکھا گیا ہے۔ خط نستعلیق ہے جو کہیں کہیں شکستہ مائل ہو جاتا ہے۔ کاتب نے پہلے حاشیے پر باریک قلم سے عنوانات لکھے ہیں پھر متن میں انھیں شنگرفی روشنائی سے درج کیا ہے۔ رکابے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ نسخہ کرم خوردگی کا شکار ہونے کے باوجود پڑھا جا سکتا ہے اور قابل استفادہ ہے۔ نسخے کے ۱۰۸ ورق شمار کیے گئے ہیں(۲۱۶ صفحات)، ۱۶ سطور۔ نسخے کے آستر بدرقہ پر کتب خانے کی طرف سے نسخے کے کوائف کے اندراج کے لیے ایک مطبوعہ پرچی چسپاں ہے جس پر'' کتب خانہ ندوۃ العلما لکھنو، عاریت از جناب نواب سید نجم الحسن خان صاحب بہادر و جناب نواب سید ظہور الحسن خان صاحب بہادر'' لکھا ہے۔ گویا یہ نسخہ نوابان مذکور کے ہاں سے ندوہ کے کتب خانے میں آیا ہے۔ نسخے کی جلد بندی یا کتابت میں تھوڑی گڑبڑ نظر آتی ہے۔ دیوان میں شامل ایک ترجیع بند جس کا ٹیپ کا شعر یہ ہے:

گر این لیلی از خیمہ بیرون شود بسا کوہ و صحرا کہ مجنون شود

اس کا ایک بند(ردیف ''کشیم'') نسخے کے شروع میں آ گیا ہے جب کہ باقی پورا ترجیع بند نسخے کے آخر میں ہے۔(ق ۸۹ ب، ۹۳ الف) موجودہ صورت حال میں نسخہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

گران جانی خود بہ زلفی دہیم یکی کوہ از تار مویی کشیم

نسخۂ علی گڑھ میں اس بند میں مندرجہ بالا بیت سے قبل بارہ اشعار ہیں۔ ٹیپ کا شعر لکھنے کے بعد کاتب نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر مناجات کا عنوان دیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

خداوندا بزخم سینہ ریشان بمویی از جنون دل پریشان

نسخہ اس شعر پر ختم ہوتا ہے:

همی کن ختم خط این مقالت　　بمُہر مِہر آن ختم الرسالت

چونکہ دیوان ہاشم کے مشمولات کی مفصل فہرست نسخۂ علی گڑھ کے تعارف میں گذر چکی ہے یہاں نسخۂ ندوہ کے مشمولات کی مجمل فہرست دی جاتی ہے: مناجات (۱الف۔۶الف)،تضرّع بدرگاہ ختمی پناہ (۶الف ۔۷الف)، منقبت پیر طریقت (۷ الف۔ ۹ الف)،نظم اسامی پیرانِ ما،عروجاً (۹الف۔۹ب)،مثنوی نجم وحدت متعلقہ شیخ احمد سرہندی (۱۰الف۔ ۱۵الف) غزل (۱۵ الف۔ ۱۵ب)، حکایت (۱۶الف۔۱۹الف)، دیوان غزلیات (۱۸الف۔۵۱الف) چہار غزل بہ اشارت شاہزادہ ہا (۵۱الف۔ ۵۲ب)، پنج بند و نہ رباعی در مرثیہ برادر خود محمد اسحاق (۵۲ب۔ ۵۵ب)، قصیدہ و رباعیات در مرثیہ برادر دوم محمد قاسم خضری (۵۵ب۔۵۷الف)،[چہل] رباعیات المقتبسات من الآیات (۵۷الف۔ ۶۰ الف)،رباعیات در تضمین احادیث (۶۰ب۔۶۳الف)،غزل در بیان مقامات وشعبہ ہای موسیقی (۶۳ب۔۶۴الف)،فردیات، رباعی وقطعہ (۶۴الف۔ ۶۵ب)، قطعہ بہ حضرت جدّی سلمہ اللہ (۶۵ب)،قطعات وفقرات تاریخی (۶۶الف۔۷۰الف)، رباعیات المنتخبات، ردیف وار (۷۰الف۔ ۸۵الف)،ترجیع بند (۸۵ب۔۸۹الف)،سات بندوں پر مشتمل ہے،اس کا ٹیپ کا شعر یہ ہے:

جز محیط شراب جملہ سراب　　فاتقوا اللہ یا اولوا الالباب

دوسرا ترجیع بند (۸۹ب۔۹۳الف)، چھ بندوں پر مشتمل ہے۔اس کا ٹیپ کا شعر یہ ہے:

گر این لیلی از خیمہ بیرون شود　　بسا کوہ و صحرا کہ مجنون شود

اسی ترجیع بند کا ایک ٹکڑا نسخہ کے ورق ۱۱الف پر ہے۔گویا یہ بھی سات بندوں پر مشتمل ہے۔ ورق ۹۳الف کے بعد کاتب نے سرخیوں کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔نسخۂ علی گڑھ سے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظمیں حسب ذیل ہیں: منقبت خواجہ بہاالدین نقشبند (۹۳الف۔۹۴الف)،ساقی نامہ (۹۴الف۔ ۹۵ب)،ورق ۹۵ب پر درج رکابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ یہاں سے ناقص ہے اور ورق ۹۶الف۔ ۱۰۲الف پر چھوٹی چھوٹی مثنویات ہیں۔مثنوی درعذر تاخیر بہ میر محمد نعمان (۱۰۲ب)، مثنوی در قصہ درویش لدھہ (۱۰۳الف۔۱۰۸الف)۔

نسخۂ ندوہ اور نسخۂ علی گڑھ کے ایک سرسری تقابل سے معلوم ہوا کہ نہ صرف نظموں کی ترتیب

میں نمایاں فرق ہے بلکہ عنوانات کی عبارتوں میں بھی کچھ لفظی اختلافات ہیں۔مثلاً نسخۂ علی گڑھ میں درج عنوان ''الرباعیات المضمنات من الاحادیث النبویہ علے قایلھا الصلوات والتحیہ'' کو نسخۂ ندوہ میں سادہ زبان میں ''رباعیات در تضمین بعضی از احادیث شریفہ'' لکھا گیا ہے۔نسخۂ علی گڑھ میں شیخ عیسیٰ ہے اور ندوہ میں شیخ عیسیٰ سندھی۔نسخۂ ندوہ کے حصۂ قطعات تاریخ میں مندرجہ ذیل حضرات کی وفات کے قطعات نہیں ہیں۔داشمند بدخشانی، میر مومن بلخی کبروی، میر عبداللہ احرار، خواجہ حسام الدین احمد، قاضی شکر اللہ۔غزلیات کے حصے میں بھی کچھ غزلیں نسخۂ علی گڑھ کے مقابلے میں کم ہیں۔امید ہے جب کوئی محقق دیوان ہاشم کشمی پر جم کر کام کرے گا تو نسخوں کے باہمی تقابل سے مندرجات کی کمی وبیشی کا میزان سامنے آجائے گا۔

دیوان ہاشم کشمی کا ایک نسخہ اورینٹل مینوسکرپٹس کتب خانہ، مدراس میں ہے۔یہ ۱۹۲ ورق پر مشتمل ہے (بحوالہ A catalogue of Persian and Arabic Manuscripts in the Madras, Government Oriental Manuscripts Library ج ۱، ص ۲۰۷) لیکن سردست اس کی تصدیق نہیں ہوسکی اور نہ ہی مزید تفصیل دستیاب ہے۔

پروفیسر محمد اسلم نے دیوان ہاشم کا ایک نسخہ ایڈنبرا میں بتایا ہے (تاریخی مقالات، ص ۱۶۴) لیکن کوئی تفصیل نہیں دی۔ایڈنبرا، اسکاٹ لینڈ کے دارالحکومت ایڈنبرگ کو کہتے ہیں۔ہمیں ایڈنبرگ یونیورسٹی لائبریری کے عربی، فارسی مخطوطات کی فہرست کے اشاریے میں ''دیوان ہاشم'' کا اندراج ملتا ہے (اشرف الحق، ص ۴۲۲) جس کے آگے نمبر (379-380) دیکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔مذکورہ نمبر کے تحت فہرست میں اردو زبان میں مراثی ہاشم علی کے نسخے کا ذکر ہوا ہے۔یہ مرثیے حضرت علی، امام حسن وحسین اور دیگر شہدا سے متعلق ہیں اور دو جلدوں میں ہیں، اس نسخے کا سال کتابت ۱۱۹۳ھ ہے۔ آغاز اس مرثیے سے ہوتا ہے:

کوئی نہ تھا بیگانہ از بند و خطا ظلم تھا سب خویش و سب اقوام کا

فہرست میں ہاشم علی کو خواجہ محمد ہاشم کشمی سمجھ کر سب حالات انھی کے دیئے ہیں اور ایسی فہرستوں کا حوالہ دیا ہے جہاں جہاں دیوان ہاشم کشمی کا ذکر ہوا ہے (ص ۳۳۴)۔یہ ایڈنبرا کے فہرست نویسوں کی صریح غلطی اور خلط مبحث ہے اور اسی سے پروفیسر محمد اسلم کو اشتباہ ہوا ہے۔

چونکہ ''ہاشم'' تخلص کے متعدد شاعر تاریخ میں گذرے ہیں اور مختلف کتب خانوں میں ''دیوان ہاشم'' کے نسخے بھی ملتے ہیں۔فہرست نگاروں نے بعض اوقات صرف دیوان ہاشم لکھ کر ذکر کیا ہے۔ عین ممکن ہے نامعلوم ''دیوان ہاشم'' میں سے کچھ نسخے تحقیق وتقابل کے بعد دیوان محمد ہاشم کشمی نکل آئیں جیسا کہ فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان اور فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی کتاب خانۂ ندوۃ العلما لکھنو میں جو نامعلوم 'دیوان ہاشم' متعارف ہوا ہے وہ درحقیقت محمد ہاشم کشمی کا دیوان ہے۔ضرورت ہے کہ ایسے تمام نامعلوم 'دیوان ہاشم' کے نسخوں کا ازسرنو جائزہ لے کر اصل شاعر کا تعیّن کیا جائے۔

ہم مضمون کا اختتام ہاشم کشمی کی اُس نظم پر کر رہے ہیں جو انھوں نے فارسی اصول موسیقی پر لکھی ہے۔یہ اس لیے بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کے ایک قریبی مرید اور تربیت یافتہ کی موسیقی سے دلچسپی اور دستگاہ پر دلالت کرتی ہے۔

بر مقامِ دہ و دو، بیست بود شعبہ و چار زان حجازست بہ دوشعبہ، سہ گاہست وحصار

پنجگاہست و مبرقع بہ جہان شعبۂ راست بہ عراق آی ومخالف ہمہ مغلوب شمار

بہ حسینی چو دو گاہست و محیّر شعبہ بہ صفاہان شدہ نیریز و نشابورک یار

پس بزرگست؛ ورا شعبہ ہمایون و نہفت زاول و اوج دوشعبہ است بہ عشاق نزار

ہمچو نوروز کہ خاراست نوا را ماہور چارگاہ از پی عُزال بہ زنگولہ شمار

بوسلیکست بہ دو شعبہ، عشیران و صبا شعبۂ کوچک را رکب و بیاتی بنگار

در رہاوی سوی نوروز عجم تاز و عرب زین مقامِ دہ و دو، رفتہ شش آوازہ برآر

دورِ گردانیہ از راست وز عشاق بگیر بہر سلمک بہ صفاہان شو و زنگولہ بیار

بوسلیکست وحسینی پی نوروز اصل ز بزرگ و ز رہاوی شدہ شہناز اظہار

کوچک آمد بہ عراق، مایہ از مادر زاد از حجازست و نوا ساز گوشت تو بہ تار

ہم بہ ہر شعبہ دو گوشہ ست و بہ ہر یک نامی چہل و ہشت بود ہمہ، جملگی از روی شمار

ہر مقامیست مناسب بہ یکی کوکب و برج ہم بہ وقتی و بہ طبعی و بہ قومی و دیار

بنوا دہ دلِ شب را بہ صفاہان شب گیر بہ گہِ صبح رہاوی بہ دو ساعت زِ نہار

بعد آن وقت حسینی ست؛ گہِ چاشت عراق استوا راست بہ کوچک دم پیشین شدہ یار

بوسلیکست گہِ عصر وزان پس عشاق   شام زنگولہ؛ حجازست بہ خفتن بیدار
پاس اول زشب از بہر بزرگست وکنون   بہر دہ قسم تغنی تو یکی بیت بیار
سرغزل پیشرو و قول، دگر نقشین است   نقش و سربند و ترانہ،عمل و ریختہ، کار

(ورق ۱۷۰ب۔۱۷۱الف)

ماخذ ومنابع

(۱)احمد منزوی،فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۸۷، ج۸۔(۲)اشپرنگر: A.Sprenger, A Catalogue of the Arabic, Persian and Hindudstani Manuscripts of the libraries of king of Oudh, Calcutta.1954. (۳)اشرف الحق: Ashraful Hukk, Muhammad; Hermann Ethe; Deward Roberstson, A Descriptive Catalogue of the Arabic and Persian Manuscripts in Edinburgh University Library, University of Edinburgh,1925. (۳)ایتھے: Herman Ethe, Catalogue of Persian Manuscripts in the Library of India office, Landon.1903. (۵)حبیب اللہ: Habibullah, A.B.M, Descriptive Catalogue of the Persian, Urdu & Arabic Manuscripts in the Dacca University Library, Dacca.1968. (۶)روزینہ انجم نقوی، مقدمہ غزلیات محمد ہاشم کشمی، لاہور، دارالنوادر، ۲۰۲۰۔(۷)رہتسک: Edward Rehatsek, Catalogue Raisonne of the Arabic, Hindostani, Persian and Turkish MSS in Mulla Firuz Library, Bombay.1873. (۸)عارف نوشاہی، مقالات عارف، تہران، بنیاد موقوفات دکتر محمود افشار، ۲۰۰۷۔(۹)عارف نوشاہی، نقد عمر، لاہور، اورینٹل پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ طبع دوم۔(۱۰)فہرست میکروفیلم نسخہ ہای خطی فارسی و عربی کتابخانۂ مولانا آزاد دانشگاہ اسلامی علی گڑھ ہند۔تھیہ و چاپ کنندہ میکروفیلم نور ایران و ہند با ہمکاری دانش گاہ اسلامی علی گر، ۲۰۰۰۔(۱۱) فہرست نسخہ ہاے خطی فارسی کتابخانۂ ندوۃ العلما لکھنو، تہیہ وترتیب ونشر مرکز تحقیقات زبان فارسی در ہند، دہلی، ۱۹۸۶۔(۱۲)کلیم سہسرامی، ”دیوان ہاشم“، خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ، شمارہ ۷۸۔۸۰، سال اشاعت ۱۹۹۲ء۔(۱۳)محمد ابراہیم، مولوی، اکادمی مخطوطات توضیحی فہرست، سری نگر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی

آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ۱۹۸۶ء۔(۱۴) محمد اسلم، تاریخی مقالات، لاہور، ندوۃ المصنّفین، ۱۹۷۰، طبع اول۔ (۱۵) محمد اسلم، سفر نامۂ ہند، لاہور، ریاض برادرز، 1995۔(۱۶) محمد اشرف، فہرست مشروح فارسی مخطوطات در سالار جنگ میوزیم و کتب خانہ، حیدرآباد، ڈائریکٹر سالار جنگ میوزیم و کتب خانہ، ۱۹۶۹۔(۱۷) محمد اقبال مجددی، تذکرۂ علما و مشائخ پاکستان و ہند، لاہور، پروگریسو بکس، ۲۰۱۳۔(۱۸) محمد اقبال مجددی، مقدمۂ مقامات معصومی تالیف صفر احمد معصومی، لاہور، ضیا القرآن پبلی کیشنز، ۲۰۰۴۔(۱۹) محمد اقبال مجددی، تعلیقاتِ مکتوبات امام ربانی، بہ کوشش عارف نوشاہی، استنبول، ارقم پبلی کیشنز، ۲۰۱۸۔(۲۰) محمد اکرم اکرام، آثار الشعرا، اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۲۰۰۸۔(۲۱) محمد صادق ہمدانی، طبقات شاہجہانی، تصحیح و تدوین محمد احتشام الدین، علی گڑھ، مرکز تحقیقات فارسی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ، ۲۰۱۳۔(۲۲) محمد ہاشم کشمی، دیوان ہاشم کشمی، قلمی، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شمارہ ضمیمہ فارسیہ ادب نمبر ۱۷۲، تاریخ کتابت ۱۰۶۶ھ۔(۲۳) محمد ہاشم کشمی، دیوان ہاشم کشمی، قلمی، نسخۂ ندوۃ العلما لکھنو، قلمی، شمارہ ۲۰۶، بلا تاریخ۔(۲۴) محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، لکھنو، محمود پریس، ۱۳۰۲ھ۔(۲۵) محمد ہاشم کشمی، طُرق الوصول فی شریعۃ الرسول، قلمی، کتب خانہ پیر ابوالخیر عبداللہ جان مجددی، پشاور۔(۲۶) محمد ہاشم کشمی، نسمات القدس من حدائق الانس، قلمی، کتب خانہ شیخ الاسلام شیخ عارف حکمت، مدینہ منورہ۔

خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر غلام یزدانی کی نظر میں

ڈاکٹر معین الدین عقیل☆

ڈاکٹر غلام یزدانی (۱۸۸۵ء-۱۹۶۲ء) اپنے زمانے کے معروف وممتاز ماہر آثار قدیمہ تھے۔ان کا فارسی، عربی اور اردو ادبیات کا ذوق بھی مثالی تھا۔تاریخ اور آثار قدیمہ ان کا اختصاصی مضمون تھا، جس میں ان کی متعدد انگریزی تصانیف، اور اہم تاریخی متون میں سے ''شاہجہاں نامہ'' اور ''مثنوی مولانا روم'' کی ترتیب و تدوین ان کی اہم یادگاریں ہیں۔مملکت آصفیہ حیدرآباد میں محکمۂ آثار قدیمہ سے منسلک رہ کر محکمے کے لیے عربی و فارسی کتبات پر جو تحقیقی کام انھوں نے کیے وہ مقالات کی صورت میں شائع ہوکر اہل علم کی ستائش کا سبب بنے اور اس کام کی بنیاد پر ہندوستان گیر اور عالمی شہرت وتوقیر پائی۔(۱)

دہلی کے ایک معزز گھرانے میں ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے بی اے اور کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور دہلی، کلکتہ اور لاہور کے مختلف کالجوں میں فارسی اور عربی کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔۱۹۰۵ء میں حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ سے منسلک ہوکر ایسی خدمات انجام دیں کہ جب مملکت آصفیہ میں محکمہ آثار قدیمہ قائم کیا جانے لگا تو کسی مناسب ماہر کی تلاش ہوئی تو اس محکمے کے انگریز ماہر آثار قدیمہ جارج مارشل (George Marshall) نے غلام یزدانی کی سفارش کی جس کے نتیجے میں غلام یزدانی مملکت حیدرآباد کے محکمہ آثار قدیمہ سے اپریل ۱۹۱۴ء میں منسلک ہوگئے اور چالیس سال تک اس کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ان کی مثالی خدمات کے صلے میں حکومت ہند نے ۱۹۲۵ء میں انہیں او۔بی۔ای۔(O.B.E) کا اعزاز عطا کیا اور جامعہ عثمانیہ نے ۱۹۴۵ء میں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ۱۹۵۶ء میں ڈی۔لٹ کی

☆ کراچی۔

اعزازی ڈگریاں تفویض کیں اور ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند نے 'پدم بھوشن' کا خطاب عطا کیا۔ اگرچہ وہ مملکت آصفیہ کے محکمہ آثار قدیمہ سے منسلک تھے لیکن کتبات پڑھنے میں جو مہارت انھیں حاصل ہوگئی تھی اس کی بنا پر سارے ہندوستان میں ضرورتاً اس خدمت کے لیے سرکاری طور پر ان سے رجوع کیا جاتا تھا۔ اگرچہ ان کے کارنامے اور ان کی محققانہ تصانیف و مقالات بہت بڑی تعداد میں ہیں لیکن قدیم تاریخی آثار میں سے غارہائے ایلورا، اجنتا، بیدر اور بیجاپور کے تاریخی آثار، متعدد قلعوں اور مندروں اور ماقبل تاریخ قبرستانوں کی دریافت اور ان سب پر ان کی مرتبہ تحقیقی کتابوں کی وجہ سے وہ ایک غیر فانی شہرت و امتیاز رکھتے ہیں۔ اسی مہارت اور شہرت کے سبب انھیں متعدد اسلامی ممالک اور یورپ کے آثار قدیمہ کے معائنے اور جائزے کے مواقع بھی ملتے رہے اور اسی بنا پر ان کی شہرت عالمگیر بھی رہی۔ 'رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن' اور عالمی سطح کے اس جیسے کئی علمی و تحقیقی اداروں کے وہ اعزازی رکن بھی نامزد کیے گئے، ۱۳ر نومبر ۱۹۶۲ء کو حیدرآباد میں انتقال کیا۔

فنی اور تاریخی نوعیت کی انگریزی کتابوں کے علاوہ اردو میں "یادگار فرحت" ان کی ایسی کتاب ہے جس میں اردو کے صاحب طرز انشا پرداز اور حیدرآباد میں ان کے معاصر فرحت اللہ بیگ سے ان کی عقیدت ومحبت اور روابط کا اندازہ ہوتا ہے۔ (۲) اردو ہی میں ان کی دوسری تصنیف: "دکھنی آرٹ پر دو مقالے" ہے۔ (۳) ان کے علاوہ معاصرین پر ان کا ایک مقالہ: "چند مشاہیر" (۴) بھی بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے جس سے مشاہیر علم وادب سے ان کے روابط اور تعلقات کا علم ہوتا ہے۔ اسی زمرے میں ان کا ایک مضمون خواجہ حسن نظامی پر بھی ہے، جو شاید اب تک غیر مطبوعہ رہا ہے۔ غالباً یہ مضمون کسی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا جس کے لیے عنوان "خواجہ حسن نظامی، میری نظر میں" انھیں دیا گیا تھا لیکن غلام یزدانی نے عنوان سے الفاظ: 'میری نظر میں' حذف کر کے یہ نوٹ لکھا تھا کہ:

> "مضمون کے عنوان میں سے یہ الفاظ میں نے خارج کر دیے ہیں "میری نظر میں"، کیونکہ ان میں 'انانیت' کا جذبہ پایا جاتا ہے اور میں کم از کم یہ لکھنا گستاخی ہی سمجھتا ہوں"۔

اس سے قبل کہ غلام یزدانی کا وہ مضمون ملاحظے میں آئے، یہ مناسب ہے کہ خود خواجہ حسن نظامی ڈاکٹر غلام یزدانی کو کس طرح جانتے اور ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے، یہ بھی دیکھ لیا جائے۔

خواجہ حسن نظامی نے بکثرت کتابیں اور کتابچے لکھے اور کئی رسائل شائع کیے۔ بہت مختصر

شذرات بھی لکھے اور شخصی خاکے بھی اپنے رسائل میں بکثرت تحریر کیے۔ان کے شخصی خاکوں کا ایک مجموعہ ''خواجہ حسن نظامی، خاکے اور خاکہ نگاری'' ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے مرتب کیا ہے۔(۵) جس میں ایک بڑی تعداد میں وہ شخصی خاکے ہیں جنھیں خواجہ صاحب نے اپنے رسائل میں شائع کیا لیکن ایسے شخصی خاکے صرف یہی نہیں جو مستقل طور پر انھوں نے تحریر کیے تھے، بلکہ ایسے متعدد شخصی خاکے مزید تلاش کیے جاسکتے ہیں جو ضمنی اور سرسری طور پر انھوں نے لکھے اور وہ کسی اور نوع کی تحریر میں بین السطور شامل ہیں، جنھیں الگ کرنا اور ان کا ایک مجموعہ مرتب و شائع کرنا ایک اور کام ہے، جسے ہونا ضرور چاہیے۔ان خاکوں اور مذکورہ مجموعے سے قطع نظر خواجہ حسن نظامی کے خاکوں کا ایک اور مجموعہ ''مادر ہم درد'' بھی تھا،(۶) جو ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کی دسترس میں شاید نہ آیا کیوں کہ ''مادر ہم درد'' کے خاکے ان کے مرتبہ مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔اس مجموعے میں غلام یزدانی پر بھی ایک مختصر خاکہ شامل ہے، جسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

مولوی غلام یزدانی: ''دہلی کے رہنے والے ہیں۔زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد میں گزارا ہے جہاں وہ آثار قدیمہ کے ناظم تھے، اب پینشن ہوگئی ہے۔میری ان سے قرابت بھی ہے۔قدیم اور جدید علوم کے فاضل ہیں۔آثار قدیمہ کے افسر ہونے کے سبب ہندو تاریخ اور ہندو آثار قدیم سے اتنے زیادہ واقف ہیں کہ حیدرآباد میں اور کوئی نہ ہوگا، کیوں کہ ہندوؤں کے آثار قدیم حیدرآبادی ملک میں بہت زیادہ ہیں۔ان کی انگریزی اور اردو تصنیفات آثار قدیم کی بہت قابل دید ہیں''۔(۷)

خواجہ حسن نظامی پر ڈاکٹر غلام یزدانی کے نادر و غیر مطبوعہ مضمون کو ایک ادبی و تاریخی دستاویز کی حیثیت میں خواجہ حسن نظامی کے عقیدت مندوں اور اہل ذوق کی خدمت میں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

خواجہ حسن نظامی: خواجہ صاحب کو جب سے میں نے ہوش سنبھالا، جانتا ہوں۔میرے والد مرحوم کو حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ سے بڑی عقیدت تھی۔وہ تو ہر چہارشنبہ کو درگاہ شریف میں حاضر ہوتے تھے، لیکن گھر کی بی بیوں اور بچوں کا بھی مہینے میں ایک پھیرا ضرور ہو جاتا تھا۔بچوں کی نگاہ بڑی تیز ہوتی ہے، اس لیے درگاہ کے سب چھوٹے اور بڑے میری نگاہ میں تھے۔اور ان کی خاطر مدارات سے ایک قسم کی شناسائی بھی ہوگئی تھی۔خواجہ صاحب بھی ان شناساؤں میں شامل تھے۔

لیکن یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔میں اس وقت نہ علمی قابلیت کو سمجھ سکتا تھا نہ روحانی استعداد

کو۔ سیاسی شعور کا تو ذکر ہی کیا۔ وہ اس وقت تک شاید خواجہ صاحب میں بھی پیدا نہ ہوا ہو۔ یہ میں ترپین چون برس پہلے کا ذکر کر رہا ہوں جب میری عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی اور کالج میں پہنچا تو خواجہ صاحب مجھے دلی میں ادھر ادھر نظر آنے لگے اور ان کے مضامین بھی ایک ہندو ادبی رسالے میں، جس کا معیار خاصا بلند تھا، میں نے پڑھے۔ ان کی تحریروں کا اچھوتا پن اور جاذبیت اسی وقت سے موجود ہے۔ الفاظ سیدھے سادے لیکن طرز بیان انوکھا اور نرالا۔ مذہبی رنگ بھی تحریر میں جھلکتا تھا لیکن مشرب وسیع دارا شکوہ کے عقائد سے ملتا جلتا، یعنی کرشن جی کو انبیا اور اولیا کے مساوی سمجھتے تھے، جس پر کٹر مولویوں اور تنگ نظر مشائخین نے خواجہ صاحب کو اس وقت سے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور یہ خیال بھی نہ گزرا کہ ہمہ جو'طبیعت کو 'تلاش حق' میں کتنی بے گانہ راہوں سے گزرنا پڑتا ہے تب کہیں 'مسرت' نصیب ہوتی ہے۔

خواجہ صاحب کو خدا تعالیٰ نے دو ذہنی صفتیں بدرجہ اتم عطا فرمائی ہیں جن کی وجہ سے دشمن ان کا بال بیکا نہ کر سکے اور وہ سخت سے سخت آزمائش اور مقابلے میں کامیاب نکلے۔ ان صفتوں میں سے پہلی 'لچک' ہے۔ معاندین ان پر جا و بے جا حملہ کرتے رہے ہیں اور اب بھی نہیں چوکتے لیکن خواجہ صاحب اپنی 'ذہنی لچک' کی وجہ سے ان کی مطلق پروا نہیں کرتے اور آخر وہ تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم کو گھمنڈ تھا کہ وہ اپنی تحریر سے خواجہ صاحب کو دبا لیں گے مگر خواجہ صاحب کی 'لچک' فولادی تلوار کی لچک نہیں، جتنا اس تلوار کو دبایا گیا اتنے ہی زور سے پلٹ کر وار کیا گیا۔ جس کسی کو ہجو کے مطالعے کا ذوق ہو وہ مولانا محمد علی اور خواجہ صاحب کے پوسٹر اور جوابی مضمون ضرور پڑھے۔ خواجہ صاحب کی ہجو بے شک تلوار کی کاٹ کا اثر رکھتی ہے۔ لیکن وہ اس حربے کو صرف ایسے دشمنوں کے مقابل میں استعمال کرتے ہیں جو ان کی عزت اور وقار کے درپے ہوں ورنہ ان کی روش صلح کل کی ہے۔

خواجہ صاحب کی دوسری ذہنی صفت 'لوچ' ہے جو ہر کس و ناکس کو ان کا گرویدہ بنا دیتی ہے۔ یہ 'لوچ' گفتار میں بھی ہے اور کردار میں بھی اور تحریر میں بھی۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں جب میں حیدر آباد پہنچا تو سر اکبر حیدری کو خواجہ صاحب کا عقیدت مند پایا، یہ ان ہی کے مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سیاست ایک گندی چیز ہے۔ مکاری، خود غرضی اور دروغ بیانی اس کے لازمی جزو ہیں۔ جب تک سر اکبر مرحوم پر مذہبی رنگ غالب رہا ان کی خواجہ صاحب سے

ارادت مندانہ دوستی رہی لیکن سیاسی رنگ چڑھتے ہی ان بن ہوگئی اور آخر میں تو خاصی کشیدگی ہوگئی تھی۔ زیادہ تر مہاراجہ کشن پرشاد مرحوم کی پر خلوص دوستی اور محبت کی وجہ سے بھی یہ نا اتفاقی اور بڑھی۔ کیونکہ سرا کبر خواجہ صاحب اور مہاراج آنجہانی کی گہری راہ ورسم کو اپنی ترقی کی راہ میں حائل سمجھتے تھے۔

ہاں میں 'لوچ' کا ذکر کررہا تھا۔اس کے اس سے اعلیٰ حکام تو کیا بڑے بڑے رئیس اور حکمراں بھی خواجہ صاحب کے پرستار بن گئے۔ان پرستاروں میں اہل مغرب بھی داخل ہیں اور اہل مشرق بھی، یہ ضرور ہے کہ اس عالم گیر تسخیرِ قلوب میں خواجہ صاحب کا علم وفضل، خاندانی بزرگی، اور غیر معمولی عقل اور ہوشیاری بھی داخل ہیں۔ وہ بات چیت، ادب وقاعدہ اور عمل اور فعل میں ایسے مکمل اخلاق کے حامل ہیں کہ خواہ مخواہ دل میں ان کی محبت اور احترام پیدا ہوجاتا ہے۔

بعض بے دین حکما نے مذہبی اعتقاد اور میلان کو اخلاقی کمزوری تصور کیا ہے۔بعض نے 'جنون' سے تعبیر کیا ہے لیکن فلسفیانہ بحث میں پڑنے کے بجائے اگر ہم دنیا کی تاریخ کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ انسان کی اخلاقی، ذہنی اور اقتصادی ترقی میں 'مذہب' اور 'پیروانِ مذہب' نے کیا نمایاں کام کیا ہے۔میں نے روحانی ترقی کو اس لیے شامل نہیں کیا تاکہ ان لوگوں کو جو 'روحانیت' کے قائل نہیں تاریخی شہادت کے قبول کرنے میں پس وپیش نہ ہو۔اگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی مذہب کی ضرورت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو انسانی فطرت میں 'خوف' کا احساس اور 'امید' کا میلان لازمی طور سے ملتا ہے۔اور یہی 'خوف' 'رجا' ہے جس کو مذہب نے عذاب وثواب کے رنگ میں پیش کیا ہے۔اور جس کی مستحکم بنیادوں پر مذہبی قانون قائم ہے۔ یہ بحث یہاں اس لیے چھیڑی گئی کہ جو لوگ مذہب کو محض 'ڈھکوسلا' اور پیروانِ مذہب کو کم عقل سمجھتے ہیں جان لیں کہ مذہب کی ضرورت ختم نہیں ہوگی بلکہ انسان کی بقا، جب تک دنیا میں ہے مذہب ہمیشہ اخلاقی، معاشی اور سماجی خرابیوں کو دور کرتا رہے گا۔اور انسان کو بلند سے بلند مقامات تک پہنچنے میں مدد دے گا۔

خواجہ صاحب کی ذاتِ گرامی کو جو مقبولیت ہندوستان کے ہر حصے میں حاصل ہے اور ان کے مریدین کی جو کثیر تعداد ہے، وہ نہ کسی قسم کا دھوکا ہے اور نہ عوام کا جہل اور نادانی۔ مذہب کی تلقین کرنے والوں پر ہمیشہ طرح طرح کے اتہام لگائے گئے۔خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اس قسم کی تہمتوں کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن سے پاک کرنے کے لیے فرماتا ہے: مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا

غَوٰی۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۔(سورۃ النجم، آیات: ۲-۳)

ان آیات کو سمجھنے کے بعد خواجہ صاحب کے معترضین کا منہ شاید بند ہو جائے لیکن حسد بری بلا ہے۔ فضل الٰہی کو دیکھ کر وہ جلے مرتے ہیں: اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتَاھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ (سورۃ النساء: آیت ۵۴)۔

اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے اور اس مرض کو کھوئے۔

خواجہ صاحب پر ان کے دشمن تجارتی کاروبار کی وجہ سے بھی معترض ہیں۔ حالانکہ تجارت کوئی غیر محمود چیز نہیں۔ انبیا، بزرگانِ دین، اور اہل اللہ، تجارت پیشہ حلقے میں نظر آتے ہیں۔ علم، تقویٰ، روحانیت، جو ذاتی فضائل ہیں، ان کو اگر پیشہ بنایا جائے تو برا ہے لیکن دواؤں کی تجارت یا کتابوں کی تجارت کسبِ معاش کے لیے کی جائے تو وہ ہرگز معیوب نہیں، کسی فرد یا قوم کی اقتصادی خوش حالی قابل مبارک باد ہے، نہ موردِ ملامت۔

آج سے تیس برس پہلے دلی سے ایک اخبار 'راعی اور رعیت' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کی نمایاں خصوصیت یہ نہیں کہ خواجہ صاحب اس میں دلی کے مشاہیر کے ظاہری اور باطنی خدوخال کے مرقعے مزاحیہ رنگ میں پیش کرتے تھے، جو نہایت شوق سے پڑھے جاتے تھے اور ان دنوں میں دلی میں ان مرقعوں کا بڑا چرچا تھا۔ میں حیدرآباد سے دلی گیا ہوا تھا۔ حکیم اجمل خاں مرحوم کا مرقع میری نظر سے گزرا۔ دل میں آیا کہ خواجہ صاحب کا مرقع میں کھینچوں، چنانچہ کھینچا اور چھپنے کے لیے خواجہ صاحب کے پاس بھجوایا لیکن میں نے اپنا نام راز میں رکھا۔ یہ دوسرے روز چھپ گیا۔ اس کی کاپی عرصے تک میرے پاس رہی۔ لیکن اب جاتی رہی۔ اگر خواجہ صاحب کے کسی پرانے فائل میں موجود ہو تو ان سے مستعار لے کر مناسب اقتباسات ضمیمے کے ساتھ شائع کیے جاسکتے ہیں۔ اس مرقع میں خواجہ صاحب کے حلیے، لباس اور کردار کے علاوہ ان کے ادبی کارناموں اور سیاسی قابلیت کا بھی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں ایک اور مضمون میں نے دلی کے اہل قلم کے متعلق لکھا تھا، (۸) جس میں خواجہ صاحب کا بھی مختصر طور سے ذکر ہے، وہ ملاحظہ فرمائیے:

خواجہ صاحب مجھ کو میری طالب علمی کے زمانے سے جانتے ہیں۔ اور ہمارے خاندان کے افراد سے بھی گہری راہ ورسم ہے۔ (۹) میں بھی خواجہ صاحب کی علمی اور ادبی قابلیت کا ہمیشہ مداح

رہاہوں۔اردوزبان اورادب کی ترقی میں ان کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔اپنے طرز کے آپ موجد ہیں۔ زبان سادہ لیکن شگفتہ۔بیان میں روانی اورتعقید سے پاک،مضمون کے لحاظ سے اچھوتا پن اوراس میں مذہبیت اورروحانیت کا اثر۔نرالے رمزاور کنایے۔لاتعداد کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔جن سے انہماک اور حقیقی علمی شغف عیاں ہے۔مجھے کتابوں سے زیادہ اخبار'منادی' میں ان کا روزنامچہ پسند ہے۔جس کو میں ہمیشہ شوق سے پڑھتا ہوں۔اس میں یہ اپنے خیالات نہایت لطیف پیرایے میں بیان کرتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اردوادب کے اس شعبے میں ان کا رتبہ وہی ہے جو انگریزی ادب میں اس زبان کے بعض مشہور ڈائری نویسوں کا۔اردوادب سے خواجہ صاحب کو حقیقی محبت ہے۔اس عمر میں بھی،جب کہ ان کا سن ستر سال کے قریب ہے،دلی میں شاید ہی کوئی شعروسخن کی محفل ہوتی ہو جس میں خواجہ صاحب شرکت نہ فرماتے ہوں۔اردوزبان کی ترقی کے لیے دلی سے باہر بھی دوردراز سفر کرتے ہیں۔چناں چہ حیدرآباد تک تشریف لاتے ہیں۔باوجود اپنی دیگر مصروفیتوں کے کاتب ہمیشہ سامنے بیٹھا رہتا ہے اوراصلاح اور تصحیح کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

یہ تنقید اجمالی ہے۔اور تفصیل سے خواجہ صاحب کی تصنیف پر تنقید کرنے کا میں اہل نہیں۔ چوں کہ وہ مختلف فنون اورعلوم پر ہیں۔مذہب،تاریخ،سیاست،سیرت،اقتصادیات،علم تعلیم،کون سا موضوع ہے جس پر خواجہ صاحب نے قلم نہیں اٹھایا،فرعونی تاریخ کو لیجیے تواس پر تو وہی رائے دے سکتا ہے جس کو مصر کے تمدن اور تہذیب سے پوری واقفیت ہو۔معمولی تالیفات پر بھی رائے دینی مشکل ہے۔مثلاً خواجہ صاحب کا مؤلفہ "آسان قاعدہ"،علم تعلیم کے ماہر ہی بچوں کی نفسیات اوراس قاعدے کی موزونیت کو سمجھ سکتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں خواجہ صاحب کی ذہانت اورطبیعت کی لطافت ان کی ہر کتاب اور ہر تالیف سے عیاں ہے۔"حلال خور" کو ملاحظہ فرمائیے اور پھر اس فرقے کی تلقین اور کلمے کو۔تحریر فرماتے ہیں:

"مٹی کا مٹھ،مٹی کا گھٹ،مٹی کا گھوڑا،مٹی کا جوڑا،مٹی کو نجی،مٹی کا تالا،لاڈ کنجی،
کھولو کواڑ،دیکھو دادا پیر کا دیدار۔"

اس فلسفے میں کبیر کی تعلیم کی جھلک نظرآتی ہے،مگر یہ ظرافت اورانوکھا پن خواجہ صاحب کا ہی خاص حصہ ہے۔حزنیہ رنگ میں "بیگمات کے آنسو" دل دہلانے والی داستانیں ہیں اور "بہادر شاہ کا روزنامچہ"

اور ’’ریزیڈنٹ کا روزنامچہ‘‘۔ ایسے تاریخی مؤلفات ہیں جن سے محققین ہمیشہ استفادہ کرتے رہیں گے۔

خواجہ صاحب کی عظمت اور عروج کے اسباب تلاش کرنے میں ان کے غیر معمولی حافظے اور مستعدی کو بھی بھولنا نہیں چاہیے۔ پچاس برس کا واقعہ ان سے من وعن سن لیجیے اور مستعدی اس بلا کی ہے کہ ستر برس کی عمر میں بھی یہ سرگشت کا گڈا بنے پھرتے ہیں اور سفر اور حضر دونوں میں صبح سے شام تک انھیں مطلق قرار نہیں۔ خواجہ صاحب کی سیاست کو سمجھنا میری فہم سے بالا ہے۔ البتہ اتنا عرض کرسکتا ہوں کہ نشر واشاعت (پروپیگنڈا) کے یہ بادشاہ ہیں۔ اور امریکہ میں ہوتے تو کروڑ پتی ہوتے۔ اب بھی لکھ پتی ہوں تو تعجب نہیں۔ مصرعہ:

فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ

غلام یزدانی

باغ تاریخ، خیرت آباد

حیدرآباد دکن

۱۰ رفروری ۱۹۴۷ء

حواشی

(۱) تفصیلات اور حالات وامتیازات کے لیے، متعدد معاصر مآخذ کے علاوہ: زینت ساجدہ، ’’حیدرآباد کے ادیب، انتخاب نثر‘‘، آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، حیدرآباد، ۱۹۵۸ء، ص ۳۴۵؛ سید داؤد اشرف، ’’بیرونی ارباب کمال اور حیدرآباد‘‘، شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۳-۱۴۴؛ شفقت رضوی، ’’فیضان دکن سلاطین آصفیہ کی علمی و ادبی سرپرستی‘‘، بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۸۳-۹۱۔ (۲) یہ کتاب حیدرآباد سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ (۳) الٰہ آباد سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ (۴) مطبوعہ ’’آج کل‘‘، دہلی، اگست ۱۹۴۷ء۔ (۵) مطبوعہ: پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء۔ (۶) مطبوعہ: ’’کارکن امیر خسرو لائبریری دہلی‘‘ نے ۱۹۴۹ء میں شائع کیا تھا۔ (۷) ’’مادر ہم درد‘‘، ایضاً، ۱۱۴۔ (۸) یہ مضمون ’منادی‘، ’ساقی‘ دونوں میں شائع ہوا، (غ-ی)۔ (۹) میری دادی صاحبہ مرحومہ کی مولوی سید نصیر الدین غفر اللہ لہ سے قرابت تھی۔ خواجہ صاحب کی بھی مولوی سید نصیر الدین مرحوم سے رشتے داری ہے۔ اس طرح سے خواجہ صاحب سے دور دراز کی عزیز داری بھی نکل آئی ہے۔ (غ-ی)

مولانا سید سلیمان ندوی کے دو غیر مطبوعہ خط

ڈاکٹر شمس بدایونی ☆

راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں مشاہیر علم و ادب کے تقریباً دو ہزار خطوط محفوظ ہیں۔ متعدد باران کو کتابی شکل میں مرتب کرنے یا رسائل میں بالاقساط شائع کرانے کا منصوبہ بنایا، لیکن بعض دوسری مصروفیتوں کے بہ سبب وہ منصوبہ عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔

راقم نے آج سے ۲۹، ۳۰ سال پہلے خطوط کی ایک جلد مرتب کی تھی جس میں ۵۳ مکتوب نگاروں کے ۲۳۶ خطوط مع حواشی شامل کیے تھے۔ مکتوب نگار و مکتوب الیہ کے کوائف اور خطوط میں آئے اسما کی مکمل صورت اور شناخت مع تاریخ وفات تلاش کرنے میں نہ معلوم کتنے کتب و رسائل کی ورق گردانی کی تھی اور جب نومبر ۱۹۹۱ء میں مالک رام کی کتاب "تذکرۂ ماہ وسال" چھپ کر آئی تو اپنی سخت محنت پر افسوس بھی ہوا تھا۔ یہ جلد ہنوز منتظر اشاعت ہے۔ اس جلد میں شامل بعض ممتاز مکتوب نگاروں کے نام حسب ذیل ہیں:

اثر لکھنوی، اصغر گونڈوی، علامہ اقبال، جلال لکھنوی، جوش ملسیانی، افسر میرٹھی، منشی دیا نرائن نگم، رشید احمد صدیقی، سیماب اکبرآبادی، سید سلیمان ندوی، شوکت میرٹھی، شوق قدوائی، عزیز لکھنوی، علی عباس حسینی، عبدالماجد دریابادی، مولوی عبدالحق، مسعود حسن رضوی ادیب، نیاز فتحپوری، یگانہ چنگیزی وغیرہ۔

گزشتہ دنوں میں پرانی فائلوں کو اُلٹ پلٹ کر رہا تھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) کے ایک طویل خط کا عکس برآمد ہوا، معاً مجھے یاد آیا کہ میرے ذخیرۂ خطوط میں سید صاحب کے صرف دو خط ہیں: ایک خط مولانا مفتی محمد ابراہیم فریدی، سمستی پوری (۱۹۰۸ تا ۱۹۸۶ء) کے نام ہے۔ یہ پوسٹ کارڈ پر لکھا ایک مختصر خط تھا جسے انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے کارگزار رکن ایم حبیب خاں (ف ۱۹۹۸ء)

☆ ۵۸۔ نیو آزاد پرم کالونی، عزت نگر، بریلی۔ ۲۴۳۱۲۲، (یوپی)، موبائل: ۹۸۳۷۰۹۲۲۴۵۔

مجھ سے اشاعت کے لیے لے گئے تھے اور انھوں نے غالباً اس کا عکس انجمن کے ہفتہ وار اخبار ہماری زبان دہلی میں شائع بھی کر دیا تھا، لیکن حسب وعدہ انھوں نے خط واپس نہیں کیا۔ اسے اتفاق کہیے کہ خطوط کی مرتبہ جس جلد کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا اس میں یہ خط نقل کیا جا چکا تھا لہٰذا یہ ضائع ہونے سے محفوظ رہا۔ سطور آئندہ میں یہ خط مع حواشی نقل کیا جائے گا۔

دوسرا خط تحصیل سہسوان، ضلع بدایوں کے ساکن منشی محمد شاکر حسین نکہت سہسوانی (۱۸۷۱۔۱۹۵۲ء) کے نام ہے۔ یہ بزرگ پروفیسر حنیف نقوی (ف ۲۰۱۲ء) کے حقیقی نانا تھے۔ جن دنوں میری کتاب ''شبلی کی ادبی وفکری جہات'' شائع ہوئی (۲۰۱۳ء) انھیں دنوں نقوی مرحوم نے اس طویل خط کا عکس مجھے عنایت کیا تھا۔ خط کے ساتھ اپنے نانا کے تحریر کردہ کچھ منتشر اوراق بھی۔ یہ اوراق ان کے وہ نوٹس تھے جن کی بنیاد پر سیرۃ النبی جلد اول دوم پر اعتراضات کا سلسلہ قائم کرتے ہوئے نکہت مرحوم نے سید صاحب کو ایک طویل خط لکھا تھا۔ بانسی کاغذ پر تیار کیا گیا خط کا یہ مسودہ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا، بایں سبب تسلسل عبارت مجروح ہو گیا تھا۔ نقوی صاحب کی خواہش تھی کہ میں سید صاحب کے خط کو اس کے سیاق وسباق کے ساتھ مرتب کرکے مقالہ لکھوں اور نکہت کے اعتراضات اور سید صاحب کے جوابات دونوں کا منصفانہ تجزیہ کروں۔ میں نے خود کو اس کا اہل نہ سمجھتے ہوئے سید صاحب کا خط اور نکہت مرحوم کا مسودۂ خط پروفیسر ظفر احمد صدیقی (ف ۲۰۲۰ء) کو دے دیا کہ یہ آپ کے استاد محترم کا عطیہ ہے اسے آپ ہی مرتب وشائع کریں۔ ظفر مرحوم ماضی میں شبلی کی سیرۃ النبی کا محاسبہ ومحاکمہ کر چکے تھے (مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، دہلی ۲۰۰۱ء) لہٰذا اس خط میں زیر بحث مضامین کو وہ زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے تھے۔ متعدد بار کی یاد دہانی کے باوجود وہ اس خط کو مرتب وشائع نہ کر سکے۔ حنیف نقوی اللہ کو پیارے ہوئے، ظفر احمد صدیقی نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا، کیا پتہ کب میرا بھی بلاوا آ جائے۔ لہٰذا ضروری سمجھا گیا کہ اس خط کو شائع کرکے وقف عام کر دیا جائے۔ معارف چونکہ اپنے بانیان کی تحریروں کی نشاندہی اور ان کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے، لہٰذا اس خط پر ایک تعارفی نوٹ لکھ کر اشاعت کے لیے معارف کے حوالے کیا جا رہا ہے۔

سید صاحب کا دور مراسلت کا دور تھا۔ دور دراز رہنے اور بسنے والوں کے درمیان رابطے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ ان کے دستیاب خطوط کی تعداد ان کے معاصر اور ممتاز مکتوب نگار: مہدی افادی، علامہ

اقبال، مولوی عبدالحق، نیاز فتحپوری، رشید احمد صدیقی، ابوالکلام آزاد اور عبدالماجد دریابادی سے کسی طرح کم نہیں۔ سید صاحب کے خاص احباب نے اپنے نام ان کے جملہ خطوط مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیے۔ بعض دوسرے مجموعے بھی شائع ہوئے، جن میں خطوط کی مجموعی تعداد ۱۲۷۱ ہے۔ رسائل میں مطبوعہ منتشر خطوط اس تعداد پر اضافہ ہیں۔

سید صاحب کے مطبوعہ مجموعہ ہائے خطوط کے نام حسب ذیل ہیں:

برید فرنگ (کراچی ۱۹۵۲ء)، مکاتیب سید سلیمان ندوی، مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی (لاہور ۱۹۵۴ء)، تذکرۂ سلیمان، حصہ دوم، مرتبہ غلام محمد (کراچی ۱۹۶۰ء)، مکتوبات سلیمانی، مرتبہ عبدالماجد دریابادی (لکھنؤ، جلد اول ۱۹۶۳ء، جلد دوم ۱۹۶۷ء)، سلوک سلیمانی، جلد۳، مرتبہ پروفیسر محمد اشرف (پشاور ۱۹۸۱ء)، خطوط سلیمانی از ڈاکٹر سلمان شاہجہاں پوری (کراچی ۱۹۹۳ء)۔

سید صاحب نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں خطوط لکھے ہیں۔ امکان ہے کہ انگریزی میں بھی خط لکھے ہوں۔ راقم الحروف کی معلومات میں اردو میں لکھا جانے والا دستیاب خط بنام سید عبدالحکیم دسنوی مکتوبہ ۱۲/ اگست ۱۹۱۲ء ہے (مطبوعہ معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۵۵ء)۔ آخری خط کی حتمی تاریخ ابھی طے نہیں کی جا سکی ہے۔

زیر نظر خط کا مضمون سیرۃ النبی جلد اول، دوم ہے۔ سیرۃ النبی کی جلد اول دارالمصنّفین سے ۱۹۱۸ء اور جلد دوم ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ (۱) سید صاحب نے مکتوب نگار کے جملہ اعتراضات کا جواب نہ دے کر اہم ترین اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اس کی وجہ ان کی مصروفیت اور اِنھیں ایام میں واقع سفر حجاز کی تیاری تھی۔

خط دارالمصنّفین کے پیڈ پر لکھا گیا ہے جس پر انگریزی میں شبلی اکیڈمی اور اردو میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ لکھا ہے۔ خط پر ہجری تاریخ ۴ جمادیٰ ۱۳۴۳ھ مرقوم ہے۔ بظاہر ماہ کے نامکمل اندراج سے یہ طے کر پانا مشکل معلوم ہوا کہ یہ خط جمادی الاول میں لکھا گیا یا جمادی الثانی میں۔ حسن اتفاق خط میں ایک داخلی شہادت: ''افسوس ہے کہ میں سفر حجاز کے لیے کل سفر شروع کرتا ہوں، اس لیے بہت مختصر لکھا'' سے یہ طے کرنا آسان ہو گیا کہ خط کس ماہ میں لکھا گیا۔ چونکہ معارف جمادی الاول کے شذرات میں سید صاحب نے متوقع سفر کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا اسے جمادی الاول کا مکتوبہ قرار دینا ہی

درست سمجھا۔ افسوس ہے کہ سید صاحب کی حیات میں تحریک خلافت اور مسئلہ حجاز سے متعلق کتب و رسائل میں سفر کا سنہ تو مذکور ہے لیکن تاریخ سفر کا اندراج نہیں۔ اس خط سے سفر کی تاریخ ۵ جمادی الاول ۱۳۴۳ھ/ ۲ دسمبر ۱۹۲۴ء طے ہوجاتی ہے یعنی سید صاحب ۲/ دسمبر کو اعظم گڑھ سے سفر حجاز کے لیے مجلس خلافت کے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر اجمل اصلاحی صاحب نے مطلع کیا کہ عربی مخطوطات میں جمادی لکھ کر بجائے 'ی' کے اوپر ایک یا ۲ کا ہندسہ بنانے کی روایت رہی ہے جو علامت ہے اول وثانی کی۔ سید صاحب نے اسی کا اتباع کرتے ہوئے جمادی کی ی پر ایک کا ہندسہ لکھنا کافی سمجھا۔

اس خط میں سید صاحب نے قدیم املا کی پیروی کی ہے۔ مثلاً:

اونکا (ان کا)، اوسمیں (اس میں)، جسمیں (جس میں)، بیخبری (بے خبری)، اونھوں (انھوں)، سیرۃ (سیرت)، مولٰنا (مولانا)، اسقدر (اس قدر) اسپر (اس پر) جسکے (جس کے) چہ (چھ)، نہیں، میں، ہوں وغیرہ میں نون غنہ کی جگہ نون کے نقطے کا اعلان نہیین، مین، ہون وغیرہ۔ خط کا متن پڑھنے میں بظاہر کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ اگر کہیں ابہام محسوس ہوا وہاں قلابین [ ] میں صحیح لفظ یا کذا لکھ کر وضاحت کردی گئی ہے۔ خط کا املا اور رموزِ اوقاف کو موجودہ رواج وروش کے مطابق کردیا گیا ہے۔

خط کے مکتوب الیہ نکہت سہسوانی ایک سلفی عالم تھے۔ انھوں نے عربی وفارسی، حدیث وتفسیر کا درس بھوپال کے نامی گرامی علما سے لیا تھا۔ اردو فارسی نظم ونثر پر قادر تھے۔ سید محمد عبدالباقی سہسوانی نے علمائے سہسوان کے تذکرے "حیوۃ العلماء" (طبع اول لکھنو ۱۹۲۲ء) میں ان کا ترجمہ دیا ہے۔ اس کتاب کا طبع دوم حنیف نقوی کی ترتیب سے شائع ہوا (دہلی ۲۰۱۰ء) اس میں انھوں نے حاشیہ نمبر سات کے تحت نکہت سہسوانی کی ایک کتاب خیرالکلام (مدینہ پریس، بجنور ۱۹۳۰ء) کا ذکر کیا ہے جو علامہ شمس الدین ابن قیم کی کتاب 'جلاء الافہام' کا اردو ترجمہ ہے۔ مطبوعات میں یہی ان کی واحد یادگار ہے۔ اپنے عہد کے اخبارات ورسائل میں ان کے متعدد مضامین وتبصرے شائع ہوئے۔ غیر مطبوعہ کتب ودواوین اس کے علاوہ ہیں۔ جن میں سے بعض کے مسودات نقوی مرحوم کی تحویل میں تھے۔ نکہت سہسوانی مومن کے پرستار تھے اور غالب کے، یگانہ کے طرح سخت ناقد۔ انھوں نے غالب کی شاعری کا احتساب وموازنہ کیا تھا جو اعجاز احمد معجز سہسوانی کی کتاب مومن وغالب (فیض آباد ۱۹۳۱ء)

میں بطور مقدمہ شامل ہوا۔ راقم الحروف کی کتاب غالب اور بدایوں (دہلی ۲۰۱۰ء) میں اس مقدمے پر تجزیاتی گفتگو کی گئی ہے۔ (ص: ۲۴۷ تا ۲۵۳) خط کا متن حسب ذیل ہے:

دارالمصنّفین، اعظم گڑھ
Azamgarh (U.P.)-192

محترم زاد کرمہ

السلام علیکم، والا نامہ نے مشرف کیا، آپ نے سیرت کے متعلق اپنی جن تحقیقات سے مشرف فرمایا، ان کا شکریہ۔ میرا شکوہ صرف لہجہ کی درشتی سے ہے، لکل جواد کبوۃ ولکل سیف نبوۃ، والعصمۃ للہ وحدہ" اگر کوئی انسان چند مقامات پر غلطی کرے تو وہ جاہل اور نا آشنائے فن نہیں بن جائے گا۔ علمائے متقدمین میں سے بھی کس نے غلطی نہیں کی؟ اور مسامحت اور سبق قلم یا سہو سے کون پاک و بری ہے۔ سیرت تو سیکڑوں صفحات کی کتاب ہے، آپ نے دو صفحے کا خط لکھا وہ بھی خطا و سہو سے خالی نہیں ہے۔

آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں کوئی نیا اعتراض نہیں، احباب اور ناقدین فن مطلع کر چکے ہیں اور میں غلط نامہ یا استدراک بنا کر چھپوا رہا ہوں، جو تیسری جلد کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شائع ہوگا۔ (۲)

۱۔ صفحہ ۱۴۹۔۱۶ سطر میں جس روایت زہری کو مولانا نے بلاغات زہری میں سے بتایا ہے وہ وہ روایت ہے جو "کتاب التعبیر" میں ہے اور جس میں زمانہ فترۃ میں اپنے کو پہاڑ سے گرادینے کا خیال ہے۔ آپ نے تعجب ہے کہ بخاری کتاب التعبیر کی یہ روایت کھول کر نہیں دیکھی یا دیکھی تو پوری پڑھی نہیں۔ صاف ہے، و فترۃ الوحی فترۃ حتی حزن النبی ﷺ فیما بلغنا حزنا عدا منہ مرارا کی یتردی من رؤس شواھق الجبال الخ، اب اور بلاغات کس کو کہتے ہیں، دیکھیے فتح الباری ج ۱۲، صفحہ ۳۱۶ ثم ان القائل فیما بلغنا ھو الزھری ومعنی الکلام ان فی جملۃ ما وصل الینا من خبر رسول اللہ ﷺ فی ھذہ القصۃ وھو من بلاغات الزھری، ولیس موصولا۔

ہم الزام ان کو دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا۔

۲۔ صفحہ ۲۳۹، سطر ۱۵، مسیّب کے واقعہ میں مولانا نے عینیؒ کی تقلید کی ہے، دیکھیے عینی شرح بخاری شرح حدیث مذکور، میں اس باب میں مولانا سے متفق نہیں۔

۳۔صفحہ ۲۳۹،اصل تعداد کی بجائے،'اپنی تعداد' چاہیے۔ ۴۔صفحہ ۳۵۴،سورۂ انفال کے بجائے نساء چاہیے۔ ۵۔صفحہ ۲۵۵،ابونعیم وطبرانی کس درجہ کی کتابیں ہیں؟

۶۔صفحہ ۲۵۵،سطر ۵،کعب بن مالک کی حدیث کے مقابل جو دوسری حدیث،انس بن مالک کی مسلم میں مذکور ہے، جب باہمی تقابل وتوازن میں علل واسباب کی بنا پر ایک کو دوسرے کو (کے)مقابلہ میں صحیح ماننا اگر کفروفسق ہے تو ہمارے ساتھ بہت سے اور مقدس لوگ بھی شریک ہوں گے، سائلین کا مطمحِ نظر جو کچھ ہو مگر وہ واقعیت اور علم نبوی کے خلاف تھا اور یہی مدعا ہے۔

۷۔صفحہ ۲۵۸،سطر ۱۴،کل فوج کی مجموعی اور انصار ومہاجرین کی الگ الگ تعداد کے متعلق دونوں روایتیں ہیں اس لیے یہ اختلاف ہے،دیکھیے ابن سعد صفحہ ۱۲،ج ۲۔

۸۔صفحہ ۲۰۴،سطر ۹،بحث یہ ہے کہ کسی فوج پر بے خبری میں حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ یا اس کے قبل دعوت وتبلیغ اور اطلاع ضروری ہے۔حضرت نافع سے کسی نے اس کا فتویٰ پوچھا تھا،انھوں نے جواب دیا کہ ضروری نہیں،اور اسی واقعہ بنی المصطلق سے استدلال کیا ہے کہ وھم غارّون۔مولانا کا جواب یہ ہے کہ سیرت کی روایتوں میں ایسی تصریحات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غافل وبے خبر نہ تھے بلکہ جم کر لڑے اور لڑنے کو تیار تھے۔نافع کی یہ روایت جو بخاری میں ہے،وہ ابتدا میں نافع تک ختم ہے،آغاز یہ ہے کتبت الی نافع فکتب الیّ ان النبی ﷺ اغار علی بنی المصطلق ...الخ آخر میں ہے واصاب یومئذ جویریة حدثنی به عبداللہ بن عمر و کان فی ذلك الجیش،اب 'بہ' کا اشارہ پوری حدیث کی طرف ہے یا صرف واقعۂ جویریہ کی طرف،اگر صرف اخیر واقعہ کی طرف ہے تو مولانا کا بیان کہ اصل روایت منقطع ہے صحیح ہے اور اگر پورا واقعہ مرجع ہے تو غلط ہے۔ایسی حالت میں اگر عینی اور ابن حجر میں اختلاف رائے ہو تو آپ دوسرے کو جاہل کہیں گے؟

مولانا نے ابن حجر کا قول اس روایت کی سند وعدم سند کے متعلق نقل نہیں کیا ہے جو اسی حدیث کے اندر آپ تلاش کرتے ہیں اور نہیں پاتے ہیں تو آپ تعجب کرتے ہیں، بلکہ اس مسئلہ کے متعلق نقل کرتے ہیں کہ غزوۂ بنی مصطلق کے متعلق دو قسم کی روایتیں ہیں،روایت نافع میں بے خبری و عدم تیاری کا ذکر ہے،اور سیرت کی دوسری کتابوں میں تیاری اور مستعدی کا ذکر ہے۔ابن حجر نے حدیث کے پہلو کو ترجیح دیا ہے اور تطبیق کی بھی کوشش کی ہے اور مولانا نے نافع کی اس روایت پر انقطاع کا الزام قائم کیا ہے اور چونکہ بنی مصطلق کے غزوہ کے متعلق یہ بحث ہے،اس لیے ابن حجر نے

اس کو وہیں لکھا ہے، عتق میں نہیں لکھا ہے، یہ کون سا جرم ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ حوالہ باب العتق کا ہے اور حدیث باب من ملك من العرب رقيقاً آه [کذا] میں ہے یا للعجب، آپ نے شروع میں دیکھ لیا ہوتا کہ فی العتق وفضلہ کے تحت میں یہ تمام ابواب ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر یہ جرم کیا ہوا! آپ لکھتے ہیں کہ ابن حجرؒ کی یہ بحث فتح الباری صفحہ ۳۳۳ میں تحت شرح حدیث ابی سعید خدری میں ہے، یہ بالکل غلط ہے، اگر آپ نے کتاب دیکھ کر لکھا ہے تو آپ سے یہ غلطی کیوں کر ہوئی؟ یہ بحث تو فتح الباری میں زیر خبر زہری کان حديث الافك في غزوة المريسيع ہے۔

۹۔ صفحہ ۳۳۹، سطر ۷، خطوط دعوت اسلام میں چھ نام گنائے گئے ہیں جو بروایت معتبر و مشہور تھے، باقی امرائے عرب کے نام ہیں، جن کے متعلق آپ کو سیرت میں کیا یہ عبارت صفحہ ۳۴۶ پر نہیں ملی، روسائے عرب کو جو خطوط لکھے گئے تھے ان کے جواب مختلف آئے، اس کے بعد ہوزہ بن علی، رئیس یمامہ اور حارث غسانی کے جواب کی تفصیل ہے، بقیہ امرا کے جوابوں سے خاموشی ہے، ان کا ذکر جلد دوم میں آیا ہے، جہاں دعوت اسلام کی تفصیل ہے۔

۱۰۔ صفحہ ۳۴۰، سطر......، شام میں جو عرب خاندان حکومت کرتا تھا "اس کا پایہ تخت بُصریٰ تھا جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے" آپ کو یہ موادِ تحقیق مشتبہ معلوم ہوتا ہے اور امام نووی کی تقلید پر ہم کو نفرین کی گئی ہے کہ لکل فن رجال۔ یاقوت حموی، صاحب معجم البلدان تو جغرافیہ کا امام آپ کے نزدیک ہے یا نہیں؟ دیکھیے معجم البلدان، ج ۲ لفظ "بصریٰ" بصرىٰ من اعمال دمشق وهي قصبة كورة حوران، کیا یہ بھی مشتبہ ہے؟

۱۱۔ صفحہ ۳۴۴، سطر ۱۷، "آپ نے فرمایا کہ تم واپس جاؤ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایہ تخت تک پہنچے گی" آپ لکھتے ہیں کہ "حدیث عبداللہ بن حذافہ (جس میں اس واقعہ کی تفصیل ہے) کے الفاظ یہ ہیں: فقال ابلغا ان ربّي قتل ربه، بیان واقعہ میں ان الفاظ کو جو حقیقۃً اظہار حقیقت نبوت کے لیے نہایت ہی مہتم بالشان ہیں حذف کرنے کی کیا ضرورت تھی" معلوم ہونا چاہیے کہ یہ خرقِ عادت یا معجزہ تھا، خرق عادت اور معجزہ کے ثبوت کے لیے معمولی روایت کافی نہیں، اس کے لیے ایسی روایت ہونی چاہیے جو صحیح ہو۔ کیا یہ ایسی ہی روایت ہے! مولانا نے جو لکھا ہے وہ محمد بن اسحاق کے واسطہ سے طبری کی روایت ہے۔ اخبراه ذلك عني وقولا له ان ديني و سلطاني سيبلغ ما بلغ ملك كسرىٰ و ينتهي الى منتهى الخف والحافر، دیکھیے یہ بھی پیشین گوئی ہے جو صحیح اتری۔ اگر محض مرعوبیت عقلی کی

بنا پر پہلی روایت سے پرہیز کیا گیا تو دوسری روایت سے بھی کرنا چاہیے تھا، مگر ظاہر ہے کہ پہلی روایت کے مؤیدات خارجی نہیں، اور اس دوسری روایت کے تھے، اس لیے اس کو قبول کیا۔

مولانا! ہر باب میں اس قدر جلد بدگمانی کر لینا مناسب نہیں۔

۱۲۔ صفحہ ۴۴۵، سطر ۶، نجاشی ۱ [اوّل] جس کے پاس قریش نے مسلمانوں کو واپس مانگنے کے لیے سفارت بھیجی، نجاشی ۲ [دوم] جس کے نام دعوت نامہ گیا اور وہ اسلام لایا۔ نجاشی ۳ [سوم] جس کے انتقال کی آپ نے خبر دی اور اس کے جنازے کی آپ نے نماز پڑھی، یہ تین اشخاص تھے، یا دو، یا ایک؛ براہ مہربانی اس پر محقق رائے سے مطلع فرمایئے۔ کیونکہ جناب کی رائے اس بارے میں خود نا صاف ہے، اور فتح الباری جلد ۸، صفحہ ۹۷ کا جو آپ نے حوالہ دیا ہے افسوس ہے کہ ہمارے پاس جو مطبوعہ نسخہ ہے اس میں اس واقعہ کے متعلق سوائے ذکر حدیث مسلم کے کوئی اور بات اس میں نہیں، نہ مخالف نہ موافق، جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ سیرۃ نبوی جلد اول کے صفحہ ۴۱۵ پر موجود ہے، اور جو عام ارباب سیر کے مطابق ہے۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ جس نجاشی کو دعوت نامہ گیا اور جس پر آپ نے نماز جنازہ پڑھی یہ دو تھے۔ اب اگر ایمان لانے والا نجاشی یعنی جس کے نامہ دعوت نامہ بھیجا گیا، وہ وہ نہ تھا جس پر آپ نے سنہ ۹ میں نماز پڑھی، تو اس دوسرے مرنے والے نجاشی کے ایمان کا حال تو ثابت کسی خبر و روایت سے نہیں، جو یقیناً سنہ ۶ (سالِ ارسال دعوت کے بعد اور سنہ ۹ سے پہلے کسی سنہ میں مرا ہوگا) اس لیے لامحالہ حسب روایت حضرت انس دعوت نامہ والے نجاشی سے پہلے جو نجاشی ہوگا جس کے پاس قریش نے سفارت بھیجی تھی اور جس نے حضرت جعفر سے سورۂ مریم پڑھ [پڑھوا کر] کر سنا اور آنحضرت صلعم کی تصدیق کی اس کی نماز جنازہ آپ نے پڑھی۔ مولانا شبلی مرحوم کا یہ میلان تحقیق ہے، اور یہ سنہ ۹ سے بہت پہلے کا بلکہ سنہ ۶ سے بھی پہلے کا واقعہ ہوگا، کیونکہ ایک نجاشی کے مرنے کے بعد ہی دوسرا نجاشی تخت نشین ہوتا ہوگا، یا یہ ممکن ہے کہ پہلے نجاشی نے اپنی زندگی ہی میں تخت چھوڑ دیا ہو اور دوسرا نجاشی دعوت نامے والا تخت نشین ہوا ہو، اور سنہ ۹ میں وہی پہلا نجاشی مرا ہو، جس کی نماز جنازہ آپ نے پڑھی۔

مولانا! مختلف روایات میں تطبیق اتنا آسان نہیں، کوشش فرمایئے تو اشکالات کا اندازہ ہو۔

والسلام، افسوس ہے کہ میں سفر حجاز کے لیے کل سفر شروع کرتا ہوں، اس لیے بہت مختصر لکھا۔

سید سلیمان

۴ جمادیٰ [اوّل] ۱۳۴۳ھ [یکم دسمبر ۱۹۲۴ء]

سطور بالا میں مولانا مفتی محمد ابراہیم فریدی سمستی پوری کے نام سید صاحب کے جس خط کا ذکر کیا گیا اس کا موضوع ''حیات شبلی'' (اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء) کے بعض تسامحات ہیں۔ یہ خط انھیں دنوں معارف میں باب المراسلہ کے تحت بعنوان ''حیات شبلی کی معلومات میں کچھ اضافے'' (اکتوبر ۱۹۴۸ء ص ۳۱۲ تا ۳۱۵) شائع کر دیا گیا تھا۔ مفتی صاحب نے انتہائی شائستگی کے ساتھ سید صاحب کے بعض تسامحات کی نشاندہی کی تھی، جسے سید صاحب نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے من وعن شائع کر دیا اور اس کے جواب میں جو خط لکھا وہ بھی ممنونیت کے جذبات سے پر ہے۔

مفتی صاحب صوبہ بہار کے شہر سمستی پور سے نسبت رکھتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں تلاش معاش میں بدایوں آئے اور یہیں محلہ کمنگران میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں مدرسہ شمس العلوم بدایوں میں صدر مدرس کے منصب پر فائز ہوئے۔

عالم باعمل تھے۔ میرے والد حاجی محمد روشن (ف ۱۹۷۲ء) کے دوستوں میں تھے۔ والد محترم کی وفات کے بعد بھی انھوں نے ہم لوگوں سے رابطہ رکھا، ماہ میں ایک بار ضرور تشریف لاتے اور میری والدۂ محترمہ کو سلام کہلواتے۔ میں نے ان کی زندگی ہی میں ان پر ایک تعارفی مضمون ماہنامہ 'مومن' بدایوں میں لکھا تھا جس کی نقل محفوظ نہیں رہی۔ چند رسائل و کتب: مکتوبات عالیہ، تذکار مطیب، احکام النکاح، ترتیب و تہذیب، تعلیم المنطق، مفید المطالب اور تذکرۂ نایاب ان سے یادگار ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں ایک مختصر سا رسالہ 'نماز' کے نام سے جاری کیا تھا، محلہ کمنگران میں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ خط حسب ذیل ہیں:

[۲]

بھوپال

مکرم و محترم! دامت فضائلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ والا نامہ کا شکریہ، آپ کی معلومات سے مستفید ہوا۔ امید ہے کہ ''حیات شبلی (۳) کے آئندہ اڈیشن میں اضافہ و تصحیح ہو سکے۔

آمد نامہ کے اتحادِ نام سے جو مجھے دھوکا ہوا تھا اس کا علم مجھے اشاعت سے پہلے ہو چکا تھا۔ چنانچہ غلط نامہ میں تصحیح کر دی گئی ہے۔ باقی معلومات بھی میرے لیے بہت نفع بخش اور بصیرت افزا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس زحمت کشی کی جزائے خیر دیں۔

آپ کے خط کے عنوان سے مجھے مزید خوشی ہوئی، ایک تو شمس العلوم (۴) بدایوں سے تعلق جس نے مجھے مرحوم حبیب ومحب مولانا عبدالماجد (۵) بدایونی کی یاد دلادی:

اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

دوسری خوشی اس سے ہوئی کہ آپ کو بھی خطۂ بہار سے نسبت ہے:

اے بہارا اے مدفنِ ابرار واخیارِ زمیں

امید ہے کہ آپ کبھی کبھی اپنے فیضِ رقم سے مستفید فرماتے رہیں گے۔ آپ کا خط معارف میں بھیج رہا ہوں۔

والسلام

سید سلیمان

۵؍شعبان ۱۳۶۷ھ/۱۴؍جون ۱۹۴۸ء

حواشی

(۱) میرے استفسار پر ان جلدوں کے سالِ اشاعت کی تصدیق مولانا عمیر الصدیق ندوی نے دارالمصنّفین میں موجود نسخوں کو دیکھ کر فرمادی، ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ جناب محمد الیاس الاعظمی کی کتب: کتابیاتِ شبلی ص ۲۴۔۲۳ (اعظم گڑھ ۲۰۱۱ء) اور آثارِ شبلی ص ۳۱۱۔۳۱۰، (اعظم گڑھ ۲۰۱۳ء) میں دونوں جلدوں کا سالِ اشاعت ۲۰۱۸ء درج ہے جو درست نہیں۔ (۲) میرے استفسار پر ڈاکٹر عطا خورشید نے مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ اور مولانا عمیر الصدیق ندوی نے دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں موجود جلد سوم کے طبع اول ۱۹۲۴ء کو دیکھ کر یہ اطلاع دی کہ ''سید صاحب نے اس جلد کے دیباچہ میں 'اغلاط نامہ' شامل کرنے کا تذکرہ کیا ہے، لیکن نسخے کے آخر میں یہ اغلاط نامہ موجود نہیں'' دونوں اطلاع کنندہ شکریے کے حقدار ہیں۔ (۳) حیاتِ شبلی، بار اول ۱۹۴۳ء معارف پریس اعظم گڑھ۔ (۴) یہ مدرسہ ۱۸۹۳ء میں قائم ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں گھنٹہ گھر کی عالیشان عمارت میں یہ منتقل کردیا گیا۔ مدرسہ آج بھی قائم ہے۔

''شمس العلوم'' کے نام سے مولانا عبدالماجد بدایونی نے ایک ماہنامہ بھی ۱۹۱۴ء میں جاری کیا تھا جو ۱۹۳۱ء کے بعد بند ہوگیا۔

(۵) مولانا عبدالماجد بدایونی (المتوفی ۱۹۳۱ء) بدایوں کے ممتاز عالم وخطیب، جمعیۃ العلماء وخلافت کمیٹی کے ممتاز رکن۔ کئی ایک علمی کتابوں کے مصنف، ۱۹۲۴ء میں مجلس خلافت نے ابن سعود وشریف حسین تنازع طے کرانے کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی کی قیادت میں ایک وفد حجاز بھیجا تھا۔ اس وفد کے ارکان میں مولانا عبدالماجد بدایونی بھی شامل تھے۔

میر کی سوانح اور نثار احمد فاروقی

ڈاکٹر ثاقب عمران☆

اردو شاعری میں خدائے سخن کا درجہ حاصل کرنے والے شاعر میر تقی میر کے کلام پر ہر زمانے میں گفتگو ہوتی رہی ہے۔ انھیں خود بھی اس بات کا احساس تھا:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اردو شاعری میں کون شخص بطور شاعر سب سے زیادہ قد آور ہے اس پر تو تنقید کی ابتدا سے ہی بحث ہوتی رہی ہے۔ غالب شناس، غالب کو سب سے بڑا شاعر تسلیم کرنے پر بضد ہیں اور میر شناسوں نے اس کا سہرا میر کے سر باندھا ہے۔ اگر صرف غزل گوئی تک اس بحث کو سمیٹ دیا جائے تو شاید اس مشکل سوال کا حل نہ نکل پائے۔ اسی لیے اس کو اردو شاعری کے تمام اصناف میں دیکھنے کی کوشش کی گئی اور آخر کار یہ پایا گیا کہ میر نے اردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جو ان کے عہد میں رائج تھیں، میر نے خود کو غالباً اسی بنیاد پر پورا شاعر کہا تھا۔ اس لیے ان کو غالب سے عظیم شاعر ماننے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غالب کی شاعری پر اس سے حرف آتا ہے۔

غالب کو یہ اہمیت تو حاصل ہے کہ ان کی زندگی اور شاعری کے بیشتر گوشوں پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے، اس کی ایک وجہ عہد کے فرق کی بھی ہو سکتی ہے۔ بقول خلیق انجم:

> ”میر پر تحقیق و تنقید کا اچھا اور وسیع کام نہ ہونے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ ان کے بارے میں اتنی تفصیلات نہیں ملتیں جتنی غالب و اقبال تو کیا، درد یا مصحفی اور انشا کے بارے میں بھی مل جاتی ہیں۔ دوسرا سبب یہ کہ میر کا حلقۂ تلامذہ اور حلقۂ احباب اتنا وسیع نہ تھا جتنا غالب یا داغ و اقبال کا تھا، اس لیے مراسلت بھی اتنی

☆ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ مستقل پتہ: چیپ سائیکل اسٹور، پہاڑ پور، اعظم گڑھ۔

نہ تھی۔ڈاک کا نظام بھی غالب کے زمانے میں بہت وسیع ہو چکا تھا۔تیسرا سبب یہ کہ میر کی زندگی کا وہ حصہ جو ۱۱۹۶ھ/ ۱۸۷۲ء تک دہلی میں بسر ہوا،سخت سیاسی ہیجان اور ہلچل کا،طوائف الملوکی کا دور تھا،ان سیاسی آندھیوں سے گزر کر میر کا کلام ہی محفوظ رہ گیا تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔''(۱)

میر کو دو اعتبار سے امتیاز حاصل ہے۔ایک تو یہ کہ ان کا تذکرہ 'نکات الشعرا' اردو کا پہلا تذکرہ ہے،نثار احمد فاروقی نے اپنے ایک مضمون 'معشوق چہل سالہ' میں جو ان کی کتاب 'تلاش میر' میں شامل ہے، نکات الشعرا کی اوّلیت پر سوال اٹھاتے ہوئے قیام الدین قائم کے تذکرہ 'مخزن نکات' کو اردو کا پہلا تذکرہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے؟اس سوال کا جواب کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔میر تقی میر کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی سوانح حیات خود قلم بند کی۔'ذکر میر' کے عنوان سے ان کی سوانح نہ صرف ان کی زندگی کی مکمل تصویر کشی کرتی ہے بلکہ محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کی بہت سی باتوں اور واقعات پر غور وفکر کرنے کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ غلط راہ پانے والی چیزوں پر سے پردہ بھی اٹھاتی ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے کارناموں میں متعدد اہم مخطوطوں کی تلاش،ترتیب اور طباعت بھی ہے۔'ذکر میر' بھی ان کے حصے میں آئی،جس کو انہوں نے ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع کیا۔ڈاکٹر خلیق انجم کے مطابق نثار احمد فاروقی نے 'ذکر میر' کا ترجمہ کرنے کا ارادہ ۱۹۵۳ء میں کیا تھا اور بہت جلد اس کا ترجمہ مکمل بھی کر لیا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس کی اشاعت نہ ہوسکی۔بالآخر ۱۹۵۷ء میں یہ کتاب 'میر کی آپ بیتی' کے نام سے پہلی مرتبہ مکتبہ برہان دہلی سے شائع ہوئی۔قریب ڈیڑھ سال کی مدت میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔اتر پردیش اردو اکادمی نے ۱۹۵۹ء میں اس کتاب کو انعام سے نوازا۔اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے شائع کیا۔اس کے متعلق ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا اردو کی علمی دنیا میں جس گرم جوشی سے استقبال ہوا اس سے مترجم کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔انھوں نے اس کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری ۱۹۶۲ء سے ہی شروع کردی تھی۔''(۲)

نثاراحمد فاروقی نے تقریباً ۳۵ سال میں اس دوسرے ایڈیشن کو تیار کیا۔اس میں نہ صرف پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو درست کیا گیا ہے بلکہ 'ذکر میر' کا فارسی متن بھی ازسرنو ترتیب دے کر کتاب میں شامل کیا گیا۔ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے:

> ''اب یہ خیال ہوا اس کا فارسی متن بھی شائع ہونا چاہیے۔اس مقصد سے ذکر میر کے متن کا مطالعہ کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ فارسی متن کی تصحیح کا حق ادا کرنا ابھی باقی ہے۔ انھوں [نثاراحمد فاروقی] نے اس کا مقابلہ نسخۂ رامپور سے کیا اور ممکن حد تک مطبوعہ متن کی غلطیوں کو دور کردیا۔اس کے نتیجے میں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ترجمے پر بھی نظر ثانی کی جائے۔یہ کام نثار صاحب نے اتنی دقیقہ رسی اور ایسی محنت سے کیا کہ اب اس ترجمے کا پہلی اشاعت سے کوئی واسطہ نہ رہا، اسے بالکل نیا ترجمہ ہی سمجھنا چاہیے۔جو سلیس، بامحاورہ اور شگفتہ بھی ہے، وفادار بھی۔کہیں کہیں تو فارسی اور اردو کی عبارتیں لفظ و معنی اور اسلوب و آہنگ کے اعتبار سے بالکل 'یک جان و دو قالب' نظر آتی ہیں۔''(۳)

نثاراحمد فاروقی نے ذکر میر کا فارسی متن ازسرنو ترتیب دیتے وقت 'ذکر میر' کے جتنے نسخوں تک رسائی ہوسکتی تھی ان سب کو حاصل کیا۔ان کی تحقیق کے مطابق ذکر میر کے پانچ مخطوطے دریافت کیے جاسکے۔ان نسخوں میں ایک نسخہ خان بہادر مولوی بشیرالدین صاحب کا تھا۔وہ مسلم ہائی اسکول اٹاوہ کے بانی ہیں۔اس لیے اسے نسخۂ اٹاوہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔اس مخطوطے پر ۱۲۲۲ھ بمطابق ۱۸۰۸ء کی تاریخ موجود ہے۔یہی وہ نسخہ ہے جس کا تلخیص شدہ اردو ترجمہ مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۶ء میں سہ ماہی اردو میں شائع کیا تھا اور ۱۹۲۸ء میں اصل متن کو ازسرنو ترتیب دے کر اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ طباعت سے آراستہ کیا تھا۔بقول نثاراحمد فاروقی:

> ''یہ ٹائپ میں چھاپا گیا تھا، جس میں ۶ صفحہ فہرس کے، ۲۰ مقدمے کے اور ۱۵۳ متن کے ہیں۔اس میں طباعت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں اور ترتیب کے نقائص سے بھی خالی نہیں۔(۴)

ذکر میر کا دوسرا قلمی نسخہ لاہور کا ہے جو پروفیسر محمد شفیع کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا۔اس نسخے پر تاریخ تحریر ۲۷ فروری ۱۸۱۶ء درج ہے۔مولوی عبدالحق نے اس نسخے سے بھی استفادہ کیا

تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنے مقدمے میں بھی کیا ہے۔ نثار احمد فاروقی جب ذکر میر کا اردو ترجمہ کررہے تھے تو انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ مولوی عبدالحق نے نسخۂ اٹاوہ اور نسخۂ لاہور میں موجود اختلافات کا اچھی طرح مقابلہ نہیں کیا ہے۔ غالباً ان کو یہیں سے تحریک ملی کہ ذکر میر کے اصل متن کو بھی ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ نسخۂ اٹاوہ اور نسخۂ لاہور میں موجود متعدد اختلافات میں سے ایک کے متعلق نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ”نسخۂ اٹاوہ میں جس پر مطبوعہ متن مبنی ہے، میر نے خاتمے میں اپنی عمر ۶۰ سال لکھی ہے لیکن نسخۂ لاہور میں اس کی جگہ ۵۰ سال ہے اور مطبوعہ فارسی متن کے صفحہ ۲۱۴......میں جہاں
>
> این شامتِ اعمال قیامت بسر آورد
>
> آیا ہے نسخۂ لاہور میں اس کے بعد یہ عبارت ملتی ہے:
>
> ”انچہ از اسلوب معلوم می شود، حسام الدین خاں دراصل از میان رفت، چرا کہ بدستِ دشمنان جانی افتادہ است، تا بمقدور زندہ نخواہند گزاشت۔“ (۵)

ذکر میر کا تیسرا قلمی نسخہ کتاب خانہ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے یہ نسخہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء کا ہے۔ اس نسخے میں ”این شامتِ اعمال قیامت بسر آورد“ کے بعد یہ عبارت ملتی ہے:

> ”انچہ ظاہر است حسام الدین خاں درحقیقت از میان رفت چرا کہ بدستِ دشمنانِ جانی افتادہ است تا مقدور زندہ نخواہند گزاشت۔ بیشتر اختیارِ خدات کہ او بر ہمہ چیز قادر است۔“ (۶)

نسخۂ لاہور میں درج بالا عبارت کے بعد خاتمے کی عبارت اور قطعہ تاریخ ہے۔ ساتھ ہی چند لطیفے بھی تھے جنھیں مولوی عبدالحق نے ترتیب دیتے وقت کتاب سے نکال دیا کیونکہ وہ فحش تھے لیکن نسخۂ رامپور میں میر نے کتاب کا خاتمہ اپنی تنگ دستی اور غریب الحالی پر کیا ہے جو دیگر نسخوں میں مفقود ہے۔ نثار احمد فاروقی نے وہ عبارت بھی اپنے مقدمے میں نقل کی ہے:

> ”احوال فقیر از سہ سال آن کہ چوں قدر دانے درمیان نیست و عرصۂ روزگار بسیار تنگ است توکل بخدائے کریم کہ او رزاق ذی القوۃ المتین است، کردہ بخانہ

نشستہ ام ظاہر از اسباب باعزہ چند مثل ابوالقاسم خاں برادر خرد عبدالاحد خاں محمد الدولہ ووجیہ الدین خاں برادر حسام الدین خاں و بیرم خاں صاحب خلف الصدق بہرام خاں کلاں کہ در آدمی روشی یکتائے روزگارِ خود اند وقطب لادین پسر سعد الدین خاں خانساماں، اگرچہ سنش کم است... وخالی از سعادت مندی نیست وقاضی لطف علی خاں کہ آدمیازی زید گاہ گاہ ملاقات کردہ می آید خواہ ام دست ایشان انتقاعے رسد یا نرسد رمایۂ توکل بجمین صاحبان اندو گاہے ین چنین ہم اتفاق می شود کہ کسے فقیر وشاعر و متوکل دانستہ بطریقِ نذر چیزے می فرستد محل شکر است۔ اکثر قرض داری باشم و بہ عسرت تمام بسر می کنم۔"(۷)

میر کی آپ بیتی کے شائع ہونے کے بعد جب اس کے نسخے بازار سے کمیاب ہو گئے تو اسے ازسرنو دیکھنے اور چھاپنے کی بات آئی۔ نثار احمد فاروقی نے دوسری اصلاحات کے ساتھ ابتدائیہ میں ذکرِ میر کے دو دیگر قلمی نسخوں کا ذکر کیا۔ ان میں سے ایک پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب مرحوم صاحب کی ذاتی لائبریری میں تھا اور دوسرے کے متعلق انھوں نے صرف یہ لکھا ہے کہ وہ گوالیار میں ہے۔ جب کہ ضروری تھا کہ وہ نسخۂ گوالیار کی تفصیلات بھی درج کر دیتے۔

میر کو اپنی سوانح لکھنے کا خیال کب آیا اور انھوں نے اس کے لکھنے کی ابتدا کب کی، ابھی تک یہ واضح نہیں ہوا ہے۔ البتہ نثار احمد فاروقی کا خیال ہے کہ میر نے اس کی ابتدا ۱۱۸۵ھ مطابق ۱۷۷۱ء سے بہت پہلے کر دی تھی۔ قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ ابتدا میر نے ۱۷۷۱ء کے آس پاس ہی کی۔ میر نے 'ذکرِ میر' کے مکمل ہونے کی تاریخ اس قطعہ سے نکالی:

مسمیٰ باسمی شد اے باہنر کہ این نسخہ گردد بعالم سمر
ز تاریخ آگہ شوی بے گماں فزائی عدد بست و ہفت ار بران

نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

"کتاب کے نام 'ذکرِ میر' سے ۱۱۷۰ھ نکلتے ہیں جس میں ۲۷ جمع کرنے سے ۱۱۹۷ھ حاصل ہوں گے۔"(۸)

تو کیا ذکرِ میر کے مکمل ہونے کی تاریخ ۱۱۹۷ھ ہے؟ اس کے لیے نثار احمد فاروقی کا تحقیقی ذہن

کتاب میں موجود واقعات کی جانب مبذول ہوا۔ مثلاً ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ کا حملہ اور اس کے مظالم کا بیان بھی کتاب میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نثار احمد فاروقی نے آخری عمر تک کتاب میں ترمیم و اضافے کی بات کی ہے۔ قاضی عبدالودود ذکر میر کے تینوں قلمی نسخوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''.......میرا قیاس ہے کہ یہ ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں شروع ہوئی۔ نسخۂ لاہور کا انجام بظاہر ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۲ء) میں اور نسخۂ اٹاوہ ظاہراً ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸ء) میں تمام ہوا۔ آغاز کتاب کے بارے میں میرا قیاس صحیح ہے تو کتاب کا بیشتر حصہ (نسخۂ مطبوعہ میں صفحہ ۱ سے صفحہ ۱۲۰ تک) کاماں میں قلم بند ہوا ہے، محض چند صفحے (صفحہ ۱۲۱ سے ۱۲۸ سطر ۴) دہلی میں اور باقی لکھنؤ میں۔'' (۹)

میر نے سوانح کی ابتدا میں اپنے والد اور منھ بولے چچا کی تعریف کرتے ہوئے ان کو اتنی برگزیدہ ہستیاں بنا کر پیش کیا ہے کہ عوام ان کے آستانے کی خاک کو بھی اپنی آنکھوں پر لگانا چاہتے تھے۔ نثار احمد فاروقی کے نزدیک یہ شاعرانہ مبالغہ ہے۔

> ''اس کتاب میں ابتدائی حصہ میر کے والد اور منھ بولے چچا کی تعریفوں اور مسائل تصوف سے بھرا ہوا ہے اس میں نہایت شاعرانہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ میر کے والد یا چچا امان اللہ اتنے بڑے صوفی اور بزرگ نہ تھے کہ......وہ آسمانِ درویشی کے آفتاب و ماہتاب ہوں، اس میں میر نے جی کھول کر مبالغے سے کام لیا ہے۔'' (۱۰)

میر تقی میر ۱۱ یا ۱۲ برس کی عمر میں یتیم ہوگئے۔ وہ دہلی آ گئے، لیکن میر نے زندگی کے ابتدائی گیارہ بارہ برسوں کے واقعات کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے وہ بظاہر ناقابل امکان ہے۔ بچپن کے واقعات کی چند جھلکیاں لاشعور میں کہیں نہ کہیں ضرور محفوظ رہتی ہیں لیکن تمام واقعات کا ہو بہو نقل کرنا وہ بھی ایک مدت گزر جانے کے بعد بہت مشکل ہے۔ نثار احمد فاروقی نے ان باتوں کو میر کے ذہن کی اختراع بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''انھوں [میر] نے میر امان اللہ کے ساتھ بعض درویشوں کی صحبت میں جانے کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے اقوال و اشعار نقل کیے ہیں مگر جن دنوں کی یہ باتیں ہیں اس وقت میر کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی، پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ اتنا کم سن

بچہ درویشوں کے صوفیانہ اقوال کو اس طرح سمجھ سکے کہ تقریباً تیس چالیس سال کے بعد جب وہ اپنی سوانح عمری لکھنے بیٹھے تو انھیں من وعن نقل کردے، میرا اپنا خیال ہے کہ یہ سارے واقعات میر کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں۔"(۱۱)

میر نے ایک درویش احسان اللہ کا ذکر کیا ہے کہ ان کے چچا امان اللہ ہفتے میں ایک بار احسان اللہ درویش سے ملاقات کرنے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ ان کا دروازہ اور چہار دیواری ہر طرف سے بند رہتی تھی اور لوگ اسے 'فقیر کا تکیہ' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ احسان اللہ کے گھر کے دروازے پر ایک شعر سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

خاطر آسودہ خواہی، راہِ آمد شد بہ بند چاک در پیراہنِ دیوار از دست دراست

ترجمہ: اگر تجھے اطمینان قلب درکار ہے تو آمد ورفت کے راستے بند کردے (یعنی لوگوں سے ملنا جلنا ترک کرکے گوشہ نشینی اختیار کرلے)۔ دیوار کے پیراہن میں چاک دروازے ہی کی وجہ سے ہے (یعنی زیادہ میل جول یادِ الٰہی میں قلب کو یکسو نہیں ہونے دیتا)۔

ایک مرتبہ میرا پنے چچا کے ہمراہ فقیر احسان اللہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ:

"شہر کے صوبہ دار کا چوبدار آیا اور اس کا سلام پیش کرکے کہا کہ نصرت یار خاں قدم بوسی کے لیے حاضر ہو رہا ہے۔ درویش نے فرمایا "خیر اچھا؛ ہر چند وہ فقیر سے ملاقات کا منھ نہیں رکھتا لیکن مجھے اس سے شرم آتی ہے کئی بار لوٹ کر جاچکا ہے۔ اگر اس بار بھی واپس جائے تو خدا جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو پائے، جب (صوبہ دار) دروازے پر آیا تو ہاتھی سے اُتر کر دوڑا، شرف پابوسی سے سرفراز ہوکر پانچ اشرفیاں نذر کیں۔"(۱۲)

نثار احمد فاروقی نے نصرت یار خاں کے متعلق حاشیہ میں لکھا کہ وہ سادات بارہہ میں سے تھا، عہد محمد شاہی کا ہفت ہزاری منصب دار تھا۔ اس کا اصلی نام ہدایت اللہ تھا اور اسے رکن الدولہ کا خطاب ملا تھا۔ نثار احمد فاروقی نے 'تاریخ محمدی' (قلمی نسخہ رامپور) اور 'کامورخاں کی تاریخ' (نسخۂ پٹنہ) کے حوالے سے لکھا ہے کہ تقریباً ساٹھ برس کی عمر میں ۲۲ رمضان ۱۱۳۴ ہجری کی شب کو دہلی میں نصرت یار خاں کا انتقال ہوگیا تھا۔ میر کی تاریخ پیدائش ۱۱۳۵ھ ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ میر اپنی پیدائش سے پہلے کے واقعات کے خود شاہد ہیں۔ تو کیا ذکر میر میں موجود تمام واقعات میر کے ذہن کی

اختراع ہیں یا ان میں کچھ حقیقت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔اس سوال کا جواب دیتے ہوئے نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''کتاب کا جو حصہ امیر الامرا صمصام الدولہ کے دربار سے وظیفہ مقرر ہونے اور اس کے بعد کے حالات وحادثات سے متعلق ہے وہ البتہ تاریخی حقائق ہیں اور دوسری تاریخوں سے زیادہ مستند سمجھے جاسکتے ہیں۔''(۱۳)

نثار احمد فاروقی نے 'ادبی حیثیت' کے ذیلی عنوان کے تحت کتاب کی ادبی اہمیت پر گفتگو کی ہے، اس کی ادبی حیثیت یوں بھی مسلّم ہے کہ یہ میر تقی میر کی خودنوشت سوانح ہے۔دوسری یہ کہ ذکر میر کو پہلی سوانح ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔مولوی عبدالحق نے میر کی فارسی نثر کو سادہ اور عام فہم بتایا ہے۔ لیکن میر جن کو اپنی زبان دانی پر تکبر کی حد تک فخر تھا وہ اپنی فارسی دانی کے جوہر دکھانے سے کیوں کر پیچھے رہتے۔نثار احمد فاروقی کا خیال ہے کہ:

''یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا ابتدائی حصہ میر نے خاصی محنت سے لکھا ہے اور اس دور کے 'مرزایانِ ایران' کی نقل کے شوق میں عبارت کو اتنا ادق بنا دیا ہے کہ بعض الفاظ کی تشریح خود انھیں حاشیے پر لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔''(۱۴)

انھوں نے ایک اور اہم نکتے کا ذکر کیا کہ چراغ ہدایت واحد ایسی لغت ہے جس میں ذکر میر کے مشکل الفاظ کے معنی ملتے ہیں۔دوسری لغات عموماً اس سلسلے میں خاموش نظر آتی ہیں۔

میر کی آپ بیتی کی دوسری اشاعت ۱۹۹۶ میں انجمن ترقی اردو (ہند) دلی سے ہوئی۔اس اشاعت کا جب خیال آیا تو نثار احمد فاروقی نے اردو ترجمے کے ساتھ فارسی متن کو بھی کتاب میں شامل کرنے کا التزام کیا۔اس کے لیے انھیں فارسی متن کی تصحیح وتدوین کرنا پڑی۔وہ لکھتے ہیں:

''دوسرے ایڈیشن کی تیاری کے ساتھ مجھے یہ خیال آیا کہ فارسی متن بھی تصحیح و تدوین کا تقاضا کرتا ہے۔مولوی عبدالحق نے اس کے صرف ایک قلمی نسخے سے مقابلہ کر کے بعض اختلاف حواشی میں درج کر دیے تھے۔میں نے نسخۂ رامپور رضا لائبریری سے اس کے ایک ایک لفظ کا مقابلہ کیا مگر دو اور نسخوں تک میری رسائی نہ ہوسکی جن

میں سے ایک گوالیار میں بتایا جاتا ہے۔ تصحیح متن اور مقابلے سے ظاہر ہوا کہ فارسی متن کی پہلی اشاعت میں متعدد غلطیاں رہ گئی تھیں جنھیں محض طباعت کی غلطی نہیں کہا جا سکتا۔ پھر یہ اندازہ ہوا کہ میر نے فارسی جدید لکھنے کے شوق میں چراغ ہدایت کو سامنے رکھا ہے۔"(۱۵)

اچھا ہوا کہ میر کی آپ بیتی کی دوسری اشاعت کے وقت نثار احمد فاروقی کو یہ خیال آیا کہ ذکر میر کا فارسی متن بھی کتاب میں شامل کرنا چاہیے تاکہ قاری کے لیے بھی آسانی پیدا ہو جائے۔ نثار احمد فاروقی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ جس کام کو کرنے کا ارادہ کرتے تو ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اس موضوع کا کوئی پہلو بھی تشنہ نہ رہ جائے، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تحقیق کرنا بیڑی بنانے کے مترادف ہے۔ اس کام میں صبر کے ساتھ مستقل مزاجی کی بھی ضرورت ہوتی ہے تبھی انسان اپنی منزل مقصود تک پہنچ پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی متن کی تصحیح و تدوین کرتے ہوئے انھوں نے نسخۂ رامپور سے ایک ایک لفظ کا مقابلہ کیا تاکہ متن میں کسی طرح کی کمی باقی نہ رہ جائے۔

انہوں نے ترجمہ کے ساتھ ذکر میر میں مستعمل محاوروں اور مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی تیار کی تھی لیکن وہ فرہنگ ضائع ہوگئی۔ یہاں ایک اور میر شناس فاروقی یعنی خواجہ احمد فاروقی کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ان کی ایک اہم کتاب 'میر: حیات اور شاعری' کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا تھا۔ انھوں نے کتاب کو دوبارہ لکھا، بہرحال نثار احمد فاروقی کی تیار کردہ فرہنگ کا ضائع ہوجانے والا مسودہ کیسا تھا، فاروقی صاحب کی زبانی سنیے:

"میں نے ذکر میر کے الفاظ اور محاوروں کی فرہنگ بہت تفصیل سے تیار کی، جس میں چراغ ہدایت کے علاوہ سیالکوٹی مل وارستہ کی مصطلحات الشعرا، ٹیک چند بہار کی بہار عجم، غیاث الدین رامپوری کی غیاث اللغات سے بھی استفادہ کیا......ان کے ساتھ ہی دکتور علی اکبر دھخدا کے 'لغت نامہ' سے مدد لی گئی تو ذکر میر میں استعمال شدہ ایک ایک لفظ واضح ہو گیا تھا۔ مگر وہ پوری فرہنگ ضائع ہوگئی۔ اب اس کتاب کے آخر میں جو فرہنگ دی جا رہی ہے وہ میں نے دوبارہ محنت کر کے قدرے عجلت میں تیار کی ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوگا کہ ذکر میر میں جو محاورۂ اہل ایران کا استعمال

ہوا ہے اس کا دو تہائی سے زیادہ حصہ چراغ ہدایت کا مرہون منت ہے۔"(۱۶)

یعنی میر نے سراج الدین علی خان آرزو کی لغت 'چراغ ہدایت' کو سامنے رکھ کر جدید فارسی لکھنے کی کوشش کی تھی۔ نثار احمد فاروقی نے چراغ ہدایت کے سنہ تصنیف پر بھی گفتگو کی ہے۔ خان آرزو چراغ ہدایت سے پہلے سراج اللغۃ کو تاریخ ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۴ء میں مکمل کر چکے تھے، بقول نثار احمد فاروقی، آرزو نے چراغ ہدایت کو سراج اللغۃ کے حصہ دوم کے طور پر لکھا تھا۔ ایسی صورت میں چراغ ہدایت کی ابتدا ۱۷۳۴ء سے پہلے ممکن نہیں۔

نثار احمد فاروقی کا سوال ہے کہ میر نے چراغ ہدایت کو سامنے رکھ کر ذکر میر میں جدید فارسی کے الفاظ استعمال کیے تھے، یا پھر آرزو نے ذکر میر کے سامنے آنے کے بعد اس میں مستعمل مشکل الفاظ اور محاوروں کو چراغ ہدایت میں شامل کیا تھا؟ میر کی پیدائش ۲۳-۱۷۲۲ء میں ہوئی تھی اور ان کے والد محمد تقی کا انتقال ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۷۳۳ء میں ہوا تھا۔ اس کے بعد ہی میر کو تلاش معاش کے سلسلے میں دہلی آنا پڑا۔ بقول نثار احمد فاروقی "میر جب خان آرزو کے ساتھ رہ رہے تھے اور یہ زمانہ ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۱ء سے ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء کے درمیان یا اس سے کچھ آگے پیچھے کا ہوسکتا ہے۔"(۱۷) یہی وہ وقت ہے جب خان آرزو چراغ ہدایت پر کام کر رہے تھے۔ ممکن ہے کہ میر نے خان آرزو کی چراغ ہدایت کے سلسلے میں کچھ مدد کی ہو۔ نثار احمد فاروقی رقم طراز ہیں:

> "میر جس زمانے میں خان آرزو کے ساتھ رہ رہے ہیں یہی وہ وقت ہے جب چراغ ہدایت لکھی جا رہی تھی۔ چراغ ہدایت میں ایک تاریخ ۳ ذی قعدہ ۲۶ جلوس محمد شاہی ملتی ہے جو ۳ ذی قعدہ ۱۱۵۷ھ کے مطابق ہے (یعنی ۷ دسمبر ۱۷۴۴ء) اس کا ایک قلمی نسخہ مولوی محمد شفیع لاہوری کے کتب خانے میں تھا جس کا ترقیمہ خود آرزو نے اپنے قلم سے ۲۷ رجب ۱۱۶۰ھ/ ۳۱ راگست ۱۷۴۷ء لکھا ہے، اس کا عکس نوادر الالفاظ میں چھپا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کتاب کی تسوید کا کام ۱۱۴۷ھ/۱۷۴۴ء اور ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء کے درمیان ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میر نے اس کا مسودہ صاف کرنے میں آرزو کی مدد کی ہو یا کسی اور حیثیت سے تعاون کیا ہو۔ اسی سے انھیں جدید فارسی کے ان محاورات کا علم ہوا جو ایران سے آنے والے استعمال کرتے تھے اور کلاسیکی فارسی

پڑھنے والے ہندوستانیوں کو ان محاوروں سے واقفیت نہیں تھی۔ انھوں نے ذکر میر کے بعض واقعات خصوصاً اس کا ابتدائی حصہ ان محاورات کو کھپانے کے لیے ہی تصنیف کیا ہے۔" (۱۸)

مزید لکھتے ہیں:

"انھیں [میر کو] یہ کتاب لکھنے کی ترغیب چراغ ہدایت سے ملی اور انھوں نے ایرانی محاورہ استعمال کرنے کے شوق میں اس کتاب کی داغ بیل ڈالی۔ یہ کلاسیکی فارسی، ایرانی محاورے اور سبکِ ہندی کی آمیزش کا ایک خوشگوار مرکب ہے، اس میں میر کا اپنا منفرد اسلوب ملتا ہے، وہ چھوٹے چھوٹے مربوط اور خوبصورت جملے لکھتے ہیں، ان کی نثر میں بھی اکثر رعایتِ لفظی اور مراعاۃ النظیر کا وہ التزام موجود ہے جو میر کے شاعرانہ اسلوب کا خاصہ ہے۔" (۱۹)

نثار احمد فاروقی نے میر کے یہاں سے فارسی جدید کی چند مثالیں بطور دلیل بھی نقل کی ہیں۔

میر نے مارچ ۱۷۳۹ء سے لے کر مارچ ۱۷۸۹ء تک کے واقعات قلم بند کیے ہیں۔ اس وقت میر کے سامنے سوانح حیات کا کوئی نمونہ نہیں تھا اس لیے انھوں نے ذکر میر میں اس طرح سے حالات قلم بند نہیں کیے ہیں جس کا سوانح تقاضا کرتی ہیں۔ انھوں نے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو قلم بند کرنے کی کوشش کی جس کے وہ خود شاہد تھے۔ اس طرح ذکر میر صرف میر کی سوانح ہی نہیں پیش کرتی بلکہ اس میں تاریخی عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں:

"ذکر میر میں جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں ان کے تحلیلی اور تقابلی مطالعہ سے بعض اہم نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ میر کا مقصد اپنے زمانے کی تاریخ لکھنا نہیں تھا وہ خود جن حوادث کی لپیٹ میں آئے ہیں ان کا بیان کرنے سے اس زمانے کے تاریخی وقائع سامنے آ گئے ہیں۔ بظاہر میر کسی گروہ بندی میں بھی نہیں ہیں......"۔ (۲۰)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ ذکر میر سے مصدر تاریخ کی حیثیت سے کسی نے استفادہ نہیں کیا۔

کتاب سے میر کے اسفار کی تفصیلات بھی معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ آگرے سے دہلی میں پہلی بار آمد، تقریباً ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴-۳۵ء۔ ۲۔ آگرے سے دہلی میں دوسری بار آمد، حملۂ نادر شاہ کے بعد۔ تقریباً ۱۷۴۱ء/ ۱۱۵۳ھ۔ ۳۔ دہلی سے سرہند کا سفر، ۱۱۶۱ھ/

۱۷۴۸ء۔ ۴۔ دہلی سے پشکر (راجستھان) کا سفر، ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء۔ ۵۔ پشکر سے اجمیر کا سفر، ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء۔ ۶۔ دہلی سے فرخ آباد کا سفر، ۱۱۶۲ھ/۱۷۵۰ء۔ ۷۔ دہلی سے سکندر آباد (ضلع بلند شہر)، شعبان ۱۱۶۷ھ/ جون ۱۷۵۴ء۔ ۸۔ دہلی سے برسانہ۔ ۹۔ برسانہ سے کمھیر (راجستھان)۔ ۱۰۔ راجا ناگرمل کے ساتھ شجاع الدولہ کے پاس تک کا سفر۔ ۱۱۔ کمھیر سے دہلی میں آمد۔ ۱۲۔ دہلی سے آگرے کا سفر (۲۳ سال کے بعد)، ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۴ء۔ ۱۳۔ دہلی سے آگرے کا دوسرا سفر، ۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۶-۶۷ء۔ ۱۴۔ راجا ناگرمل کے ساتھ کاماں کا سفر، ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۱ء۔ ۱۵۔ کاماں سے فرخ آباد کا سفر، ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۱ء۔ ۱۶۔ فرخ آباد سے دہلی کا سفر، ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۲ء۔ ۱۷۔ دہلی سے سکّرتال کا سفر، ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۲ء۔ ۱۸۔ واپسی میں نجیب آباد، نہٹور، شیر کوٹ، سیوہارہ، سیلم پور، امروہہ، گڑھ مکتیسر (مکتیشور) ہاپوڑ ہوتے ہوئے دہلی، ۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء۔ ۱۹۔ دہلی سے براہ فرخ آباد لکھنؤ کا سفر، ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ/ مارچ ۱۷۸۹ء۔ ۲۰۔ آصف الدولہ کے ساتھ بہرائچ کا سفر۔ ۲۱۔ آصف الدولہ کے ساتھ پیلی بھیت اور دامنِ کوہ ہمالیہ کا سفر۔(۲۱)

یہ وہ اسفار ہیں جن کی فہرست نثار احمد فاروقی نے تیار کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے میر کے ایک اور سفر کا ذکر کیا ہے جس کی تفصیل میر کی ایک مثنوی ''نسنگ نامہ'' سے ملتی ہے۔ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''......میر نے بعض سفر کیے جن کا تذکرہ ذکر میر میں نہیں ہے، نسنگ کے سفر کا حال کلیات میر میں شامل مثنوی نسنگ نامہ سے معلوم ہوتا ہے۔''(۲۲)

نثار احمد فاروقی نے ایک اور اہم بات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ خان آرزو اور میر حسن کے متعلق یہ مفروضہ عام ہے کہ خان آرزو نے میر حسن کے کہنے پر میر تقی میر پر ظلم کیے اور ان کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ نثار احمد فاروقی نے اس واقعے کے ضمن میں ایک نیا پہلو پیدا کیا ہے جو حقیقت سے قریب بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے میر اور خان آرزو کے درمیان کشیدگی پیدا ہونے کی وجہ شیعہ اور سنی اختلافات کو بتایا ہے۔ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''خان آرزو اور میر کے تعلقات کی خرابی یا کشیدگی کے لیے جن لوگوں نے میر کے مذہبی معتقدات یعنی تشیع کو سبب بتایا ہے وہ مناسب نہیں، اس لیے کہ خان آرزو بھی کچھ متشدد قسم کے سنی نہ تھے اور میر کم سن تھے۔ ان کے اعتقادات میں ایسی جارحیت نہ تھی جس سے کوئی فتنہ پیدا ہو اور خان آرزو اتنے بے رحم ہو جائیں کہ میر کی

یتیمی، غربت اور بے کسی کا بھی خیال نہ کریں۔''(۲۳)

میر کے یہاں شدتِ عشق کا پوچھنا ہی کیا، وہ تو کہتے ہیں کہ:

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

نثار احمد فاروقی نے میر کے عشق کو 'نسنگ نامہ' والا عشق سے تشبیہ دی ہے جس میں صوفیوں کا دور تک گزر نہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے سلیمان شکوہ کا ایک شعر بھی پیش کیا ہے:

دربار میں کرے ہے بیاں اپنے عشق کا دیکھو تو اس بڑھاپے میں تم میر کی ہوس

نثار احمد فاروقی کے مطابق یہی وہ عشق ہے جس نے آخری عمر تک میر کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

اس کا منھ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

اب کے جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میر دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

اتنا نہ تجھ سے ملتے نے دل کو کھو کے روتے جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا

نثار احمد فاروقی نے میر کے اسی عشق کو خان آرزو اور میر کے درمیان کشیدگی کی وجہ بتایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''...انھوں [میر] نے خان آرزو کے گھر یا خاندان میں کسی لڑکی سے عشق کیا اور بہت شد و مد کے ساتھ کیا۔ میر کے لیے یہ بالکل فطری اور نفسیاتی وقوعہ تھا، ان کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑے بھائی سوتیلے تھے۔ چھوٹے بھائی کی خود کفالت کر رہے تھے۔ اپنا وطن (آگرہ) اور گھر بار چھوڑ کر کس مپرسی کے عالم میں دہلی آئے تھے، دہلی بھی اب وہ نہ رہی تھی جو نادر شاہ کے حملے سے پہلے تھی، انھیں اپنی سوتیلی ماں کے بھائی (خان آرزو) کی سرپرستی میں رہنا اور تعلیم حاصل کرنا تھا، ان سب حالات نے ان کی جذباتی دنیا میں گہرا خلا پیدا کر دیا تھا، ان کا فطری تقاضا یہ رہا ہوگا

کہ کسی سے ٹوٹ کر محبت کریں۔مگر اس عہد کی معاشرت میں کسی کا اظہار عشق کرنا نہایت عظیم اور نا قابل معافی جرم تھا۔ایسی ہی کسی لغزش کی وجہ سے انعام اللہ خاں یقین کو خود ان کے والد نے اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا تھا۔''(۲۴)

اس سے آگے کچھ اور گمان وقیاس بھی ہیں، جن کا ذکر کر کے فاروقی نے یہی نتیجہ نکالا کہ خان آرزو نے میر کو گھر سے بے گھر کیا۔(۲۵)

حاصل کلام یہ کہ ذکر میر کے فارسی متن کی تصحیح وتدوین اور اس کا اردو ترجمہ آسان اور سلیس انداز میں پیش کیا جانا ایک قابل قدر عمل ہے۔اس کتاب کے ذریعہ میر کے حالات ہی نہیں ان کے عہد کی افراتفری بھی ظاہر ہوتی ہے اور یہی اس کی تاریخی اہمیت بھی واضح کرتی ہے۔ذکر میر اور فاروقی دونوں کی اہمیت اصحاب نظر کے نزدیک ہے اور ثبوت میں مالک رام کا یہ قول کافی ہے کہ:

''......یہ بہت اچھا ہوا جو ذکر میر کا اردو میں ترجمہ ہو گیا۔جناب نثار احمد فاروقی نے بحیثیت مترجم اپنا فرض بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔انھوں نے اصل کتاب کے مطالب سے کہیں انحراف نہیں کیا۔ترجمہ کی زبان بھی شگفتہ اور سلیس اور بامحاورہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو داں طبقہ اس کتاب سے پوری طرح مستفید ہو گا۔''(۲۶)

یقیناً ایک بیش قیمت کتاب اور اس کے ترجمے کے لیے اردو ادب نثار احمد فاروقی پر ہمیشہ ناز کرے گا۔

حوالہ جات

(۱)خلیق انجم، حرف آغاز، میر کی آپ بیتی، مترجم: نثار احمد فاروقی ص ۱۳۔(۲)خلیق انجم، مقدمہ، میر کی آپ بیتی، ص ۱۵۔(۳)ایضاً ص ۱۵۔(۴)نثار احمد فاروقی، ابتدائیہ، میر کی آپ بیتی، ص ۲۳۔ ۲۴۔(۵)ایضاً ص ۲۴۔ (۶)ایضاً ص ۲۵۔ ۲۴۔(۷)ایضاً ص ۲۵۔(۸)ایضاً ص ۲۶۔(۹)قاضی عبدالودود، بحوالہ میر کی آپ بیتی، ص ۲۶۔ (۱۰)نثار احمد فاروقی، میر کی آپ بیتی ص ۲۶۔(۱۱)ایضاً ص ۲۷۔(۱۲)میر تقی میر، میر کی آپ بیتی، ص ۸۳۔ (۱۳)نثار احمد فاروقی، میر کی آپ بیتی ص ۲۷۔(۱۴)ایضاً ص ۲۷۔(۱۵)ایضاً ص ۳۲۔۳۱۔(۱۶)ایضاً ص ۳۲۔ (۱۷)ایضاً ص ۳۷۔(۱۸)ایضاً ص ۳۶۔ (۱۹)ایضاً ص ۴۴۔(۲۰)ایضاً ص ۴۸۔ (۲۱)ایضاً ص ۴۷۔۴۸۔ (۲۲)ایضاً ص ۴۸۔(۲۳)ایضاً ص ۳۹۔(۲۴)ایضاً ص ۳۹۔(۲۵)ایضاً ص ۳۸۔(۲۶)مالک رام، مقدمہ، میر کی آپ بیتی، ص ۲۲۔

اخبار علمیہ

’’دعا یاد کرانے کا موبائل ایپ متعارف‘‘

حیدرآباد کی سائرہ ناصر رسول خاں نے ’’حضورؐ کی ۴۰ دعائیں‘‘ کے نام سے ایک منفرد موبائل ایپ متعارف کرایا ہے۔ اس ایپ کو تیار کرنے والے خالد سیف اللہ کے بیان کے مطابق یہ ایپ، ایپ اسٹور اور پلے اسٹور سے ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے اور اس ایپ کے لیے انٹرنیٹ ضروری نہیں۔ سائرہ کی اطلاع ہے کہ لوگ تواتر سے چالیس ربّنا دعائیں سن سکتے ہیں۔ دعا کے ہر لفظ کے معنی بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ صارفین ان الفاظ کو منتخب کرسکتے ہیں جن کو وہ سننا چاہتے ہیں۔ ان منتخب لفظوں کو بار بار دہرانے کی سہولت بھی ہے تاکہ دعاؤں کو یاد کرنے میں مدد مل سکے۔ صارفین دعا کوئز میں بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ ہر دعا کا ایک کوئز کئی جوابات والے سوالات پر مشتمل ہوگا۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے بالترتیب دس، آٹھ، اور پانچ ہزار کی رقم بھی مختص کی گئی ہے۔ مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں کو دعائیں یاد کروانے کا یہ منفرد طریقہ اور اقدام قابل تحسین ہے۔

(سیاست حیدرآباد، ۲۱/۴/۸ء، ص ۹)

’’ویکسین لگانے کا طریقہ سلطنت عثمانیہ نے ایجاد کیا‘‘

دنیا میں پہلے پہل ویکسین کے طریقہ کار کا استعمال خلافت عثمانیہ میں شروع ہوا اور وہی اس طریقہ کے موجد ہیں۔ یہ عمل ابھی ابتدائی شکل میں تھا جو ترکی میں سفیر برطانیہ کی اہلیہ میری ورٹلی مانٹیگیو کے ذریعہ برطانیہ پہنچا جہاں ایک معالج ایڈورڈ جینز نے چیچک سے تحفظ کی پہلی ویکسین تیار کی۔ اس کا اندازہ لیڈی مانٹیگیو کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۷۱۷ء میں استنبول سے لندن میں اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ شاہی طبیب لوگوں کے جسم پر کٹ لگا کر ایک خاص چیز لگاتے ہیں جس سے لوگ چیچک سے محفوظ رہتے ہیں۔ یو، ایس لائبریری آف میڈیسن اور بیلر یونیورسٹی میڈیکل سینٹر کی ویب سائٹ کے مطابق مانٹیگیو کے شوہر ایڈورڈ ۱۷۱۷ء سے ۱۷۲۱ء تک ترکی میں برطانیہ کے سفیر تھے۔ ان کی اہلیہ چیچک کے موذی مرض میں مبتلا تھیں اور بڑی مشکل سے ان کی جان بچ پائی تھی۔ ان کے کئی عزیز اور دوست اس عارضہ سے جاں بحق ہوچکے تھے جس کے سبب وہ خوف زدہ اور اپنے بچوں

کو اس سے محفوظ رکھنا چاہتی تھیں اس لیے ان کو بذات خود اس کے علاج میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ رپورٹ میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ ۱۸ ویں صدی میں ہر سال صرف یورپ میں چار لاکھ کے قریب اس وبا سے ہلاک ہوجاتے تھے اور صحت یاب ہونے والوں میں سے ایک تہائی اپنی بینائی کھو بیٹھتے تھے اور ان کے چہروں پر بدنما داغ بھی پڑ جاتے تھے۔ جب وہ ۱۷۱۷ء میں برطانیہ پہنچیں تو ترکی میں اس مرض پر قابو دیکھ کر ان کو حیرت ہوئی اور ترکی میں اس طریقۂ علاج پر ان کو بھروسہ ہوا اور انہوں نے اپنے پانچ سالہ بیٹے کو کٹ لگوانے کے لیے سفارت خانہ کے ایک معالج کے ساتھ شاہی طبیب کے پاس بھیجا۔ اس کے بعد جب یہ خاندان واپس وطن آیا تو برطانیہ کے معالجوں کو اس طریقۂ علاج پر قائل کرنے کے لیے اپنی چار سالہ بیٹی کا ترکی کے طریقۂ علاج کے مطابق یعنی کٹ لگا کر دوا لگائی جو ترکی سے ان کا معالج لے کر آیا تھا۔ تاجروں کے توسط سے بھی اہل یورپ کو ترکی میں چیچک کے کامیاب علاج کی خبریں پہنچتی تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ کوہ قاف اور ایشیائی روسی ریاستوں سے سلطنت عثمانیہ کے محل کے لیے لائی جانے والی کنیزوں کو بھی حفظ ماتقدم کے طور پر ٹیکہ لگایا جاتا ہے تاکہ وہ چیچک سے محفوظ رہیں۔ پہلے تو برطانیہ کے شاہی معالج اس کو ٹوٹکا قرار دے کر نظر انداز کرتے رہے لیکن جب برطانوی سفیر کے خاندان نے اپنی بیٹی کو اس تجربہ کے لیے پیش کیا تو وہ اس بارے میں سنجیدہ ہوئے اور پہلے پہل چھ قیدیوں پر اس کے تجربہ کا اجازت نامہ دیا۔ انہیں کٹ لگا کر دوا دی گئی اور کچھ عرصہ چیچک زدہ ماحول میں انہیں رکھا گیا اور وہ محفوظ رہے۔ بالآخر ۱۷۹۶ء میں ڈاکٹر ایڈورڈ جینز نے چیچک زدہ گائے سے حاصل کردہ مواد سے دنیا کی پہلی ویکسین متعاف کرائی۔

(سیاست حیدرآباد، ۲۰/ ۵/ ۲۱ء، ص ۲)

”اسباب النجاۃ لفرقۃ العصاۃ کے اردو ترجمہ کی اولین اشاعت“

یہ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (۱۳۸۱ء) کی فارسی تصنیف ہے۔ جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے معدودے چند قلمی نسخے ہی دستیاب تھے۔ خبر ہے کہ خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سٹی نے پہلی بار اس کا اردو ترجمہ ”اسباب نجاۃ“ کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کے عربی و فارسی متن کا ترجمہ مولانا محمد عابد چشتی نے کیا ہے اور اس میں وارد احادیث و اقوال کی تخریج مولانا منت اللہ

مصباحی نے کی ہے۔مزید مفید اور کارآمد بنانے کے مقصد سے اس کی ترتیب و تحقیق اور تقدیم کا فریضہ صاحب سجادہ خانقاہ منعمیہ نے انجام دیا ہے۔اس کا موضوع اوراد اور نصائح ہے جس کے جامع قاضی اشرف بن رکن بلخی ہیں۔واضح رہے کہ اس سے قبل خانقاہ منعمیہ نے حضرت مخدوم جہاں کی ''اوراد اشرفی'' کا مکمل اردو ترجمہ ''مخ المعانی'' اور ''کنزالمعانی'' کا اردو ترجمہ بھی پہلی بار شائع کیا تھا۔رپورٹ میں یہ بات بھی درج ہے کہ ''اسباب نجاۃ'' کا اجرا سید شاہ محمد سیف الدین فردوسی اور ان کے صاحبزادہ سید شاہ حسام الدین فردوسی کے بدست عمل میں آیا اور ڈاکٹر امجد علی خاں کی فرمائش اور تحریک کے نتیجہ میں یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے۔(پندار، پٹنہ، ۲۰/ ۵/ ۲۱ء، ص ۳)

''پرندوں کی موجودہ تعداد پر تحقیق''

ایک حالیہ جائزہ میں کہا گیا ہے کہ کرۂ ارض پر پرندوں کی تعداد ۵۰ ارب سے زیادہ ہوسکتی ہے۔ان میں چار اقسام کے پرندوں کی تعداد بہت زیادہ یعنی اربوں میں ہے، جب کہ دوسری جانب پرندوں کی سیکڑوں قسمیں شدید خطرے میں ہیں۔رپورٹ کے مطابق عام چڑیا، یورپی مینا، بگلا اور ابابیل وغیرہ میں سے ہر ایک کی تعداد اس وقت ایک ارب سے زیادہ ہے۔پرندوں کی ۱۱۸۰/ انواع ایسی ہیں جن کی تعداد پانچ ہزار یا اس سے بھی کم ہے۔اس طرح مجموعی طور پر زمین کے ہر فرد کے لیے چھ جنگلی اور غیر پالتو پرندے موجود ہیں۔۲۴ برس قبل جب یہ اندازہ لگایا گیا تھا تو اس وقت ان کی تعداد ۲ سے ۴ ارب بتائی گئی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پرندے تیزی سے ختم ہورہے ہیں۔بلکہ اس کی وجہ طیور شماری کی جدید ترین ٹکنالوجی ہے جو پرانے تخمینوں کو رد کررہی ہے۔اس کے لیے ایک آن لائن ڈیٹا بیس ای برڈ سے استفادہ کیا گیا ہے۔اس میں عام شہری، سائنس داں، طالب عالم اور پرندوں کو دیکھنے اور شمار کرنے والوں کے تجربات شامل ہیں۔ان کے علاوہ دنیا بھر کے ماہرین سے حاصل ہونے والے سیکڑوں ڈیٹا بیس سے اس کا تقابل اور موازنہ کیا گیا ہے۔اس ڈیٹا میں اب تک ۹۲۴۷/ انواع کے پرندوں کو شامل کیا گیا ہے۔اس کے بعد جدید ترین ماڈل بنایا گیا جن سے اس تعداد کا اندازہ کیا گیا ہے۔واضح رہے کہ یہ تحقیق یونیورسٹی آف نیوساؤتھ ویلز کے پروفیسر کورے کیلگن اور ان کے ساتھیوں نے کی ہے۔(تاثیر، پٹنہ، ۲۰/ ۵/ ۲۱ء، ص ۷) (ک۔ص۔اصلاحی)

علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر

(ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس دہلی میں کیا ہوگا اور کیا کیا ہونا چاہیے۔)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی ندوہ کو نہ صرف جدید و قدیم کا سنگم اور فضلائے ندوہ کو مجمع البحرین بنانا چاہتے تھے بلکہ ان کی تمنا تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جن مذہبی اور معاشرتی مسائل کا سامنا ہے ان سب کا مرکز ندوہ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے وہ نئی تجاویز پیش کرتے۔ نئے نئے منصوبے بناتے اور ان سے اراکین ندوہ کو آگاہ کرتے۔ اور ان سے رائے مشورہ کرتے۔ ندوہ کے کئی اجلاس میں، جن سے پہلے انہوں نے آئندہ کے منصوبے اخبارات میں پیش کیے تاکہ فضا سازگار اور ہموار رہے۔ ایسا ہی انہوں نے ندوہ کے ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی سے متعلق متعدد تجاویز پیش کی تھیں۔ جو اخبار پیسہ لاہور میں ۱۷ر فروری و ۲۵ر فروری ۱۹۱۰ء کے شماروں میں شائع ہوئی تھیں۔

راقم نے پروفیسر احمد سعید سے جنہوں نے اخبار پیسہ ۱۹۰۷ سے ۱۹۴۷ء کا اشاریہ تیار کیا اور جسے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔ یہ درخواست کی کہ علامہ شبلی کی یہ نادر تحریر حاصل کرنے میں ہماری مدد کریں۔ چنانچہ انہوں نے اخبار پیسہ سے اس کا عکس بھیجا۔ افسوس موصوف نے ۱۳ر جنوری ۲۰۲۱ء کو وفات پائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

یہ تحریر دو قسطوں میں شائع ہوئی ہے مگر دستیاب دوسری قسط پر قسط سوم لکھا ہوا ہے، جبکہ پہلی قسط پر اس طرح کی کوئی وضاحت نہیں ہے۔ البتہ اس کے سر آغاز سے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے کچھ شائع ہو چکا ہے، مگر اشاریہ پیسہ اخبار لاہور اور اس کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے باوجود تلاش و تفحص کے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

☆ رفیق اعزازی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، واٹس ایپ: 9838573645۔

علامہ شبلی کی یہ بیش قیمت تحریر جو ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے، متعدد وجوہ سے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے جہاں علامہ شبلی کی متعدد تعلیمی، ملی اور معاشرتی مسائل و معاملات سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں ان کے بعض ملی منصوبوں کی بھی صراحت ہوتی ہے۔ اس نادر تحریر سے یقین ہے افکار شبلی کی تفہیم میں مدد ملے گی۔ اس لیے اسے قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔

(۱)

کارروائی متعلق حفاظت مسلمین و انسداد ارتداد: ہندوستان کے اکثر حصوں میں نو مسلم آباد ہیں جن کو اسلامی عقاید و احکام سے اس قدر ناواقفیت ہے کہ نماز، روزہ ایک طرف ان کے نام بھی لچھمن سنگھ اور رام سنگھ ہیں۔ یہ قومیں نہایت آسانی سے مخالفین کے دام میں آجاتی ہیں۔ اس فتنہ کے انسداد کی تدبیریں جا بجا ہو رہی ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ تمام علما اور دیگر بزرگان قوم یکجا ہو کر مشورہ اور اتفاق سے اس فتنہ کے روکنے کے لیے ایک مفصل دستور العمل منضبط کریں اور تمام قوم مل کر اس کام کو انجام دے اور جس قدر کوششیں ہو رہی ہیں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور منسلک ہو جائیں۔ ندوہ کی طرف سے ایک مفصل یادداشت پیش ہوگی جس پر تمام حاضرین سے اظہار رائے اور مشورت کی خواہش کی جائے گی۔ اس امر پر بھی بحث ہوگی کہ آریہ وغیرہ کے مباحثہ میں جو تحریریں لکھی جاتی ہیں ان کا طرز تحریر کیا ہونا چاہیے تاکہ تہذیب و علم و مسامحت کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

تصحیح کتب مروجہ انگریزی متعلق باسلام: انگریزی زبان میں آنحضرتؐ اور علم اسلامی واقعات کے متعلق جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں ان میں جا بجا نہایت سخت غلطیاں ہوتی ہیں جو دل آزاری کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں غلطی سے کورس میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ایک مختصر کمیٹی قائم ہونی چاہیے جو ان غلطیوں کا انتخاب کرے اور ان کی غلطی کو مستند تاریخی کتابوں سے ثابت کرے۔ یہ تحریر انگریزی ترجمہ ہو کر عام طور پر اور بالخصوص مدارس انگریزی میں شائع کرائی جائیں۔

سیرۃ النبویؐ پر ایک مبسوط مستند اور جامع تصنیف: اس وقت تمام کاموں سے زیادہ اہم، زیادہ مقدم اور زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نہایت مستند، مفصل تاریخ اردو زبان میں تیار کی جائے۔ عیسائی اور دیگر قوموں میں اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں زیادہ تر اسی وجہ سے ہیں کہ ان کے پیش نظر وہ انگریزی کتابیں ہیں جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

سوانح عمری نہایت غلط واقعات اور اتہامات پر مشتمل ہے۔

آنحضرتؐ کے حالات میں اردو زبان میں بھی کوئی کتاب پڑھنے کے قابل نہیں۔جس قسم کی کتاب آج کل مطلوب ہے اس کی تیاری میں حسب ذیل باتیں ضروری ہیں۔

۱۔عربی کی تمام مستند اور نادر کتابیں جو آں حضرتؐ کے حالات کے متعلق ہیں اور اکثر قلمی ہیں بہم پہنچائی جائیں۔

۲۔انگریزی میں آں حضرتؐ کی جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں بہم پہنچائی جائیں۔

۳۔ایک مستقل اسٹاف (عملہ) رکھا جائے جن میں مصنف،مترجم اور کاتب ہوں اور ندوہ کی نگرانی میں مبسوط اور مفصل سیرت نبوی تیار کی جائے۔

۴۔اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر شائع کیا جائے۔

اس کے لیے تمام قوم سے مجموعی اعانت کی ضرورت ہے اور اسلامی ریاستوں سے اس میں اعانت کی درخواست کی جائے۔

قومی کتب خانۂ اعظم: تمام ہندوستان میں کوئی عام قومی کتب خانہ نہیں ہے جس میں اسلامی زبانوں کی تمام ضروری اور نادر تصانیف مجتمع ہوں۔لوگوں کے ذاتی کتب خانے یا ریاستوں کے کتب خانے ہیں جن سے ہر شخص متمتع نہیں ہوسکتا۔اس لیے ضرورت ہے کہ ایک بڑا کتب خانۂ عام قائم کیا جائے جس میں تدقیقِ انتخاب کے ساتھ مخصوص طور پر وہ تمام کتابیں بہم پہنچائی جائیں جو ماہرین فن کی تصنیف ہیں اور جن سے مسلمانوں کے اجتہادات واختراعات کا اندازہ ہوسکتا ہے،اس کی مفصل اسکیم جلسہ میں پیش ہوگی اور اس سے اندازہ ہوسکے گا کہ کام کس قدر ضروری ہے اور اس کے انجام پانے کے کیا وسائل ہیں۔

انتظام تعلیم مذہبی مدارس سرکاری میں: یہ تجویز کانفرنس میں پیش ہو چکی ہے،لیکن صرف تجویز ہی تجویز ہے۔ندوہ کی طرف سے اس کی عملی کارروائی ہونی چاہیے۔

دارالافتا: ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمان ہیں اور ان کے سیکڑوں مذہبی اور دنیوی معاملات مثلاً نکاح،طلاق،وراثت،ہبہ،وصیت وغیرہ فقہ سے متعلق ہیں۔جن کے لیے ان کو علما سے استفتا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔علماء بجائے خود جو استفتا ان کے پاس آتا ہے جواب دیتے ہیں لیکن کوئی

مستقل اور با قاعدہ تنظیم نہیں۔ ہر شخص کو ان علما کے نام اور پتہ معلوم نہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایک عام دارالافتا قائم کیا جائے۔ اور اعلان عام کے ذریعہ سے تمام ہندوستان میں مشتہر کیا جائے کہ جس شخص کو کچھ پوچھنا ہو بے تکلف وہاں سے دریافت کر سکے۔ یہ بھی اعلان میں ظاہر کر دیا جائے کہ دارالافتا کو نزاعی اور سیاسی مسائل سے کچھ سروکار نہیں ہوگا۔

الفاظ جدیدہ عربی کا لغت: عرب، مصر، شام میں سیکڑوں ہزاروں نئے الفاظ زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔ جو عربی کی قدیم لغتوں میں نہیں ملتے۔ نہ اب تک خود مصر و شام میں ان کے لیے کوئی لغت تیار ہوا۔ عربی اخبارات اور حال کی تصنیفات میں یہ الفاظ کثرت سے آتے ہیں اور اس وجہ سے اکثر لوگ ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس لیے ضرور ہے کہ خاص ان جدید اور معرب الفاظ کا ایک لغت تیار کیا جائے اور ندوہ میں یہ کام شروع کر دیا گیا ہے۔ اب مکمل اور وسیع طور پر انجام پانے کی ضرورت ہے۔

مدارس عربیہ کی رپورٹ: مشہور مدارس کے سوا ہندوستان میں اس وقت سینکڑوں عربی مدارس ہیں جن کے نام اور حالات معلوم نہیں۔ اس لیے وہ قومی سلسلہ سے بالکل الگ پڑے ہوئے ہیں۔ نہ وہ کسی سے کوئی مشورہ اور اعانت لے سکتے ہیں۔ نہ ان سے کوئی اعانت کی جا سکتی ہے۔ اس لیے ضرور ہے کہ تمام مدارس کا ایک نقشہ حسب ذیل تیار کیا جائے:

۱۔ نام مقام ۲۔ نام مدرسہ ۳۔ سنہ قیام مدرسہ ۴۔ نام مہتمم مدرسہ ۵۔ تعداد مدرسین اور ان کے نام اور ان کی تنخواہیں ۶۔ تعداد طلبہ ۷۔ تعداد صفوف (کلاس) ۸۔ آمدنی و خرچ۔

اگر ابھی سے حضرات مہتممین مدرسہ اس پر توجہ کریں گے اور نمونہ متذکرہ کے موافق نقشے تیار کر کے ندوہ میں بھیج دیں تو جلسہ سالانہ میں پیش ہو سکیں گے اور آئندہ دیگر مدارس کے لیے تحریک ہوگی۔

یہ ایک مختصر خاکہ ان مذہبی اور علمی ضروریات کا ہے جو قوم کو درپیش ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ابھی سے ان تمام واقعات کی نسبت اخبارات میں بحث شروع کی جائے اور لوگ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اور جلسہ سالانہ میں تیار ہو کر آئیں تا کہ ان میں سے جس قدر کام شروع ہو سکے شروع کر دیا جائے۔

علمی مضامین اور لیکچر: ندوۃ العلماء تمام ہندوستان کے علماء کا مشترک مجمع ہے۔ ایسے عظیم الشان علمی جلسے سے ہم کو اور باتوں کے علاوہ یہ بھی توقع کرنی چاہیے کہ اس میں نادر اور مفید تحقیقات کے متعلق

علمی مضامین پیش ہوں گے یا لیکچر دیے جائیں گے لیکن اب تک جو کچھ ہوتا ہے وہ علما ہمیشہ جس قسم کے وعظ کیا کرتے ہیں یہاں بھی کہتے ہیں۔ندوہ میں آج تک کوئی علمی مضمون پیش نہیں ہوا جس سے تحقیقات کا ایک قدم بھی آگے بڑھتا۔ہم چاہتے ہیں کہ اس سال ضرور علماء کسی خاص مضمون پر تیار ہو کر آئیں، جلسہ میں اس پر کوئی تحریر پیش کریں یا لیکچر دیں۔جیسا کہ یورپ کی علمی انجمنوں میں ہمیشہ ہوتا ہے۔

راقم

شبلی نعمانی

(روزنامہ پیسہ اخبار لاہور، ۱۷ر فروری ۱۹۱۰ء، ص ۵)

(۲)

مجلس شوریٰ: ندوہ جب قایم ہوا تو دوست دشمن سب نے تسلیم کیا تھا کہ ندوہ کے مقاصد ضروری بلکہ ضروریات سے بڑھ کر ہیں۔لیکن شکایت یہ پیدا ہوتی گئی کہ ندوہ نے اپنے فرایض انجام نہیں دیے۔اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کام کے خواہش مند نہیں ہیں۔اگر صرف ظاہری دھوم دھام کردی جائے اور خالی رزولیوشن پاس کردیا جایا کریں۔تو ان کو کوئی شکایت نہیں ہوتی۔

ندوہ سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے ظاہری دھوم دھام،شوروغل،رزولیوشن اور تجاویز کا طریقہ چھوڑ دیا لیکن ہم کو ردوقدح سے قطع نظر خود غور کرنا چاہیے کہ ندوہ کو کیا کرنا چاہیے؟اور کیوں کر کرنا چاہیے۔ ۲۰ برس کے تجربہ نے ثابت کردیا ہے کہ اصلی کام عام ہنگامہ اور فوری گفت وشنود میں انجام نہیں پاتا۔ بے شبہ گرمی محفل کے لیے ندوہ میں مختلف رزولیوشن پیش کرنے چاہئیں لیکن کام کا اصل طریقہ یہ ہے کہ جس قدر ممبر اور وزیٹر جلسہ میں موجود ہوں،ان سے ہر صوبہ کے اہل الرائے اور قابل انتخاب کر لیے جائیں۔یہ لوگ ایسے ہوں جن کو خود ان کے صوبہ کے لوگ انتخاب کریں اور جن کو وہ لوگ اپنا صحیح اور جائز قائم مقام خیال کرتے ہوں۔ان لوگوں کا ایک خاص مجمع ہو اور مجمع میں سوالات ذیل پیش کیے جائیں۔

۱۔آیا مسلمانوں کی کچھ مذہبی ضرورتیں ہیں یا نہیں؟

۲۔کیا یہ ضرورتیں انجام پارہی ہیں؟

۳۔روز بروز لوگ مذہبی عقاید،مذہبی مسائل،مذہبی تاریخ سے بے خبر ہوتے جاتے ہیں یا نہیں؟

۴۔اگر ہوتے جاتے ہیں تو اس کا کیا علاج ہے۔

۵۔اور کیا انگریزی خواں طلبہ مذہبی تعلیم پاتے ہیں جس قدر پاتے ہیں کیا وہ کافی ہے؟ اگر کافی نہیں تو اس کا کیا چارۂ کار ہوسکتا ہے۔

۶۔کیا آریہ لوگ دیہات اور قصبات کے نومسلموں کو جو مرتد بناتے جاتے ہیں۔کیا اس کے روکنے کے لیے مناظرہ اور مباحثہ کافی ہے؟ اگر نہیں کافی ہے تو اس کی کیا تدبیر ہے؟

۷۔آیا مسلمانوں کو کسی ایسے فرقہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟ جو علوم مذہبی سے واقف اور مذہبی عقاید اور مذہبی مسائل کا صحیح مفسر اور شارح ہو، اگر ہے تو اس گروہ کی بقا کی کیا تدبیر ہے؟

۸۔موجودہ علما جدید مذہبی ضرورتوں کے انجام دینے کے قابل ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں ہیں تو کیوں کر اس قابل ہوسکتے ہیں؟

۹۔مسلمانوں کو ایک عام مذہبی مرکز کی ضرورت ہے یا نہیں؟

۱۰۔بوہرہ قوم میں ایک علمائے اعظم (؟) ہوتا ہے۔تمام قوم اس کو پیشوائے کل مانتی ہے اور ہر شخص اپنی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کو دیتا ہے۔وہ نہایت ایمانداری سے اس آمدنی کو مذہب کی تعلیم و تلقین پر صرف کرتا ہے اور ہر شہر میں اس کی شاخیں موجود ہوتی ہیں۔کیا اس طریقہ کے موافق عام مسلمان بھی کوئی طریقہ اختیار کرسکتے ہیں؟

غرض اس قسم کے سوالات پر لوگوں کو ابھی سے غور کرنا چاہیے اور سالانہ جلسہ کی مجلس شوریٰ میں اس کے متعلق مختصر یادداشتیں اور تحریریں پیش ہونی چاہئیں، ان پر بحث و مباحثہ ہوکر جو مسائل طے ہوجائیں۔صوبہ کے نامزد شدہ اشخاص اس کے ذمہ دار قرار پائیں اور اپنے شہروں میں جاکر ان کو انجام دیں۔ایک انسپکٹر تنخواہ دار مقرر کیا جائے جو تمام سال دورہ کرکے لوگوں کو ان کے فرائض کی طرف متوجہ کرتا رہے، یہ ضرور نہیں کہ تمام سوالات اور یہ تمام مراتب ایک ہی سال کے اجلاس میں طے ہوجائیں بلکہ غرض یہ ہے کہ ندوہ کا یہ مستقل پروگرام قرار دے دیا جائے اور ہر سال اس کے متعلق استقلال کے ساتھ کارروائی جاری رہے۔

شبلی نعمانی

(روزنامہ پیسہ اخبار لاہور، ۲۵ فروری ۱۹۱۰ء، ص۴)

ادبیات

قطعۂ تاریخ وفات

جناب انیس چشتی مرحوم

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی☆

دادہ این خبر عمیر ندوی شد فوت انیس چشتی ناگاہ
چون این خبر فجیع بودہ با غم و درد و رنج ھمراہ
ھیھات نماند انیس چشتی گفتیم باصدای ۱۴۰۰ ہفت ''آہ''

۱۴۴۲=۴۲+۱۴۰۰-۶+۷=۴۲

(۲)

قطعۂ تاریخ وفات

مولانا نورعالم خلیل امینی مرحوم

نوری کہ بود واصل عالم پی خلیل دیروز دور از گذرِ خاک وخشت رفت
دانشوری کہ حرف و حکایاتِ دین و دہر ہم در زبانِ تازی ہم اردو نوشت، رفت
استادِ باکمال کہ حبّاتِ علم و فن در سینہ ہائے نسلِ جوان سال کشت، رفت
آموزگارِ ویژہ کہ طلّاب عصر را دادہ نشان معرفتِ خوب وزشت، رفت
تاریخ رحلت او بہ گوشِ رئیس دوش ہاتف زغیب گفت کہ: ''جنّب بہشت رفت''

۱۴۴۲ھ

(۲۰۲۱ء)

☆نعمانی منزل، مکان نمبر ۴/۰۴۷، جے۔۲۴، نزد ابوہریرہ مسجد، ہمدرد نگر، بی۔جمال پور، علی گڑھ۔

حضرت مولانا سید شاہ محمد ولی رحمانی کی رحلت کے غم میں

جناب وارث ریاضی☆

الفراق اے رہ نمائے قوم و ملت الفراق
الفراق اے قائد رشد و ہدایت الفراق

اے امام قوم، اے نازِ وطن، فخر بہار
تیرے دم سے گلشنِ ملت کی تھی قائم بہار

اے امیر ملت بیضائے ما، ابن ولی
زیب دیتی تھی تجھے قوم و وطن کی سروری

اے علم بردارِ حق، اے صاف گو، روشن ضمیر
جرأت اظہار میں ملتی نہیں تیری نظیر

دین کی خاطر تو ہردم ٹھوکریں کھاتا رہا
سوزِ ایمان و یقیں سے دل کو گرماتا رہا

اے ولی! اے حضرت منت[1] کے فرزند جمیل
تیری ہستی تھی تری دینی بصیرت کی دلیل

تھا ہلال[2] قادری کے غم میں اب تک سوگوار
چھوڑ کر تو بھی گیا دنیا میں مجھ کو اشک بار

ہیں سبھی فانی جہان حسن کے نقش و نگار
مردِ مومن کے لیے دنیا نہیں جائے قرار

جان کر اک ملت بیضا کا فرزانہ تجھے
عمر بھر روئے گا ہراک، تیرا دیوانہ تجھے

اے ولی! اے نیک سیرت پیکر جود و سخا
دو ہزار اکیس ۲۰۲۱ء میں سوئے جناں تو بھی گیا

حضرت قاری محمد عثمان منصور پوری

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی☆☆

دیدم بہ روزنامہ امروز
خبری الم و فسوس آری

یعنی کہ زدیوبند سامی
کم شد مردی خجستہ کاری

آں قاری و عالم و محدث
پاکیزہ نفس، صفا شعاری

صدر و رئیس اہل دانش
بدرِ شبِ بندگی گزاری

عمراً او اگرچہ پیر بودہ
عملاً بودہ جدید کاری

قاری عثمان مردِ صالح
چون یافت ز دہر رستگاری

سال فوتش بفور گفتم
''سوی جنت شتافت قاری''
۲۰۲۱ء

☆ کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن (بہار)۔ (۱) حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی، امیر شریعت رابع اور قائد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔ (۲) خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے بالغ نظر عالم دین۔

☆☆ نعمانی منزل، مکان نمبر ۴/۴۰۷، جے۔۲۴، نزد ابوہریرہ مسجد، ہمدرد نگر، بی۔ جمال پور، علی گڑھ۔

مطبوعاتِ جدیدہ

سرسید کی اولین صحافتی کوششیں اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ: ایک تحقیقی تناظر از پروفیسر شافع قدوائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت ۴۵۰ روپے،

پتہ: براؤن بکس، اپوزٹ بلائنڈ اسکول، قلعہ روڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۱۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی اہم شخصیتوں کا مطالعہ یوں بہت اہم ہے کہ ان کے علم وعمل کی جدت نے صدیوں سے رائج طرز فکر اور طرز عمل دونوں کو گویا یکسر بدل ڈالا، ظاہر ہے ان میں سرسید کا نام سرفہرست ہے، حیات جاوید ان کا ایسا جامع تذکرہ ہے جس نے ان کی زندگی کے ہر پہلو کی نشاندہی کی اور سوانح کے تقاضہ کے مطابق کچھ روشنی بھی ضرور ڈالی، حیات جاوید کی جامعیت نے عرصہ تک مطالعہ سرسید کے دوسرے ابعاد وآفاق کی شاید کمی محسوس نہ ہونے دی لیکن ضرورت بہرحال تھی، اسی کا ایک مظہر زیرنظر کتاب ہے جس میں سرسید کی ان کوششوں کا بغور اور بالاستیعاب جائزہ لیا گیا جس سے عموماً واقفیت نہیں، اکثروں کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں تشابہ ہوجاتا ہے، اب اس کتاب نے سرسید کو مذکورہ جرائد سے بھی پہلے ان اخبارات میں تلاش کرلیا جن کو دوسروں نے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا تھا، سیدالاخبار کا ذکر تو کہیں کہیں مل بھی جاتا ہے کہ وہ سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۷ء میں جاری کیا تھا، فاضل محقق کی یہ ادا بھی بہت بھاتی ہے کہ باتوں باتوں میں وہ دوسرے لکھنے والوں کی غلطیوں کی جانب اشارہ کرتے جاتے ہیں، مثلاً اسی سیدالاخبار کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ مارگریٹا بارنس نے غلطی سے اس اخبار کو اردو کا پہلا اخبار لکھ دیا، جہاں تک گزٹ اور تہذیب سے پہلے سرسید کی صحافتی سرگرمیوں کا معاملہ ہے، اس میں زبدۃ الاخبار سے وابستگی اور اس کے شواہد کا بیان جہاں ایک گمنام کو زندگی عطا کرتا ہے وہیں اس فارسی اخبار کی کسی بھی کاپی کی عدم موجودگی میں جس طرح دوسرے شواہد سے سرسید کی اس اخبار سے وابستگی اور اس کی عملی ترتیب میں ان کی حصہ داری کا اثبات ہے وہ مصنف کی محققانہ دوربینی اور ژرف نگاہی کا ثبوت ہے، اسی طرح رسالہ خیرخواہ مسلمانانِ ہند کا ذکر بھی دلچسپ ہے اور بعض مباحث کے لحاظ سے آج بھی اہم ہے، جیسے یہ کہنا کہ "سرسید کا تصور جہاد ہمارے تشدد اساس معاشرہ کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے"، یہاں تصور جہاد اپنی جگہ لیکن مسلم معاشرہ کو تشدد اساس کہنا غلط فہمی کا ازالہ نہیں بلکہ غلط بیانی کا امالہ ہے، اسی بحث میں یہ کہنا بھی سمجھ سے کچھ پرے ہے کہ "سرسید نے صحافت کو احتجاج کا

ذریعہ نہیں بنایا...... بلکہ قارئین میں حکومت کے تئیں ایک نوع کے جذبہ وابستگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور یہی ترقیاتی صحافت کی خشت اول ہے''، وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا یقیناً امر مستحسن ہے لیکن ''یہ قرون وسطیٰ کی جذباتی پناہ گاہ سے نکالنے والی'' بات سرسید کا بنیادی مقصد کیوں کر ہوسکتی ہے؟ خصوصاً جس کے لشکر میں حالی وشبلی جیسے مردان کارزار ہوں، دوسرا مضمون علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ کے عنوان سے ہے اور یہ جس خوبی، محنت، تحقیق اور دیدہ ریزی سے لکھا گیا ہے، حق یہ ہے کہ اب تک گزٹ کا ایسا جامع اور مفصل تعارف نہ ہوا تھا، ۱۸۶۶ء سے شائع ہونے والے اس رسالہ کو عموماً ذولسانی کہا گیا لیکن فاضل مصنف نے اسے کثیر لسانی یعنی اردو، انگریزی، عربی اور فارسی زبان کے مشمولات سے بھی آراستہ بتایا، مضامین کی نوعیت کیا تھی؟ سرسید کی فکر اور تحریر کے جوہر اس اخبار سے کیسے کھلے؟ یہ بیان تو ہونا ہی تھا، اس کے علاوہ سرنامۂ موٹو، صفحات کا سائز، وقفہ اشاعت، سالانہ زرخریداری، تعداد اشاعت، مدیر اور ادارتی عملہ، اولین مدیر، مدیر ثانی، مدیر انگریزی، سرسید بطور مدیر، انگریزی سیکشن، ترقیاتی خبریں، علمی، غیر ترقیاتی، بین الاقوامی خبریں، کالج کی اور کھیل کی خبریں، ان خبروں کی زمرہ بندی، مذہبی اور بین الاقوامی، سیاسی، مفاد عامہ سے متعلق مضامین، مراسلے، اداریے، اشتہارات، پھر عربی، فارسی مشتملات جیسے ذیلی عناوین کے تحت گزٹ کو گنجینہ بتانے کی دلکش ترین کوشش، ہر سطر پر دامن دل کو کھینچتی ہی نہیں تحقیق کو فن لطیف بنانے کی مہارت پر بے ساختہ داد کے لیے مجبور کردیتی ہے، بظاہر تو یہ ایک اخبار کی داستان ہے لیکن دیکھا جائے تو یہ سرسید کی زندگی کا وہ آئینہ ہے جس میں تصویر خود عکس جمیل پر حیران نظر آتی ہے، کتاب میں دو اور ابواب ہیں لیکن اصل یہی دو موضوع ہیں جو کتاب کا سرعنوان بھی ہیں اور جنھوں نے اس کتاب کو کتابیات سرسید میں نمائندہ کتابوں کا ہمسر بنادیا ہے، مصنف کی نیت یا خیال کا اظہار بطریق احسن، پیش لفظ میں ہے، تاہم بعض مقامات سخت بھی آگئے ہیں جب وہ سرسید کے ایک تعلیمی ادارہ کے بانی ہونے کو محض اس لیے ایک جزوی خدمت مانتے ہیں کیونکہ کلیتہً سرسید کا عمل پہلودار اور وسیع تھا اور یہ کہ ان کی سول سوسائٹی کی تحریک ایسی سحر آگیں تھی کہ اس سے ایک وسیع تر انسانی رویہ کا سراغ ملتا ہے، اس وسیع تر رویہ کے جو اجزا گنائے گئے ہیں، وہ کیا واقعتہً جدید اور وسیع تر ہیں؟ ایسے کچھ سوالات ضرور ہیں جو سرسید کے ذکر میں فکر کو جلا بخش سکتے ہیں۔ (ع ـ ص)

رسید کتب موصولہ

اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی: جناب عارف رفیع، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
قیمت ۱۰۰ روپے

اوراق (شعری مجموعہ): جناب سلمان احمد، دانش محل، جھنڈے والا پارک، امین آباد، لکھنؤ
قیمت ۳۰۰ روپے

ایک بے مایہ کا سفرِ حج: مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری، مرتبہ: ام یمین، خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)
قیمت ۳۰۰ روپے

تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی علمی خدمات: حکیم وسیم احمد اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
قیمت ۴۰۰ روپے

خیال یار (شعری مجموعہ): ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، دہلی ۔۶
قیمت ۱۰۰ روپے

دشتِ جنوں (تحقیقی مضامین کا مجموعہ): ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور (مہاراشٹر)
قیمت ۲۵۰ روپے

سید ظل الرحمٰن ایک نقش جاوداں: ڈاکٹر محمد عزیز بلرامی، ابن سینا اکاڈمی، تجارہ ہاؤس، دودھ پور، علی گڑھ
قیمت ۳۰۰ روپے

شوکت پردیسی حیات اور کارنامے: ایس ایم عباس، مرتبین: جناب ابوذر انصاری و جناب محمد عرفان جونپوری، انور عباس ایڈوکیٹ، محلہ تاڑتلہ، اتچ پی او، جون پور
قیمت ۳۰۰ روپے

ضیائے غزل: قاری اشتیاق احمد، مرتب: جناب محمد عرفان جونپوری، عزیزیہ پبلی کیشنز، میرمست، جون پور
قیمت ۲۵۰ روپے

عکس (مجلہ)، (مولانا اعجاز احمد اعظمی نمبر): مدیر محمد عرفات اعجاز اعظمی، مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری نوتنواں، ضلع مہراج گنج
قیمت ۵۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعرالعجم اول	300/-
شعرالعجم دوم	150/-
شعرالعجم سوم	125/-
شعرالعجم چہارم	200/-
شعرالعجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس ودبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم ومصر وشام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	150/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
JUNE 2021 Vol - 207 (6)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیر الصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-